

# اسلام اور انسانی حقوق

اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے تناظر میں



ابو عمر زاہد الرشیدی





)

٦



# اسلام اور انسانی حقوق

اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے تناظر میں

محاضرات:

ابو عمر زاہد الرشیدی

ضبط و تحریر:

ناصر الدین خان عامر

الشرعیہ اکادمی

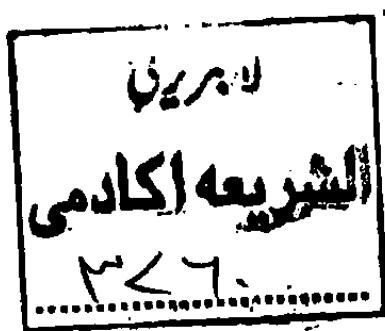
# جملہ حقوق محفوظ!

(سلسلہ مطبوعات: ۱۹)

کتاب:	اسلام اور انسانی حقوق - اقوام متحدہ
مقرر:	ابوعمار زاہد الرشیدی
مرتب:	ناصر الدین خان عامر
ناشر:	الشرعیہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ
اشاعت اول:	اکتوبر ۲۰۱۱ء
قیمت:	۱۲۵ روپے

## تخصیص کار:

مکتبہ امام اہل سنت	جامع مسجد شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ (0306-6426001)
کتاب سراۓ	احمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور (042-37320318)
دارالکتاب	A/6، یوسف مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور (042-37235094)



## فہرست

### ☆ اسلام میں انسانی حقوق کا تصور

۳۲-۹	انسانی حقوق کا اسلامی فلسفہ
۱۰	حقوق اللہ اور حقوق العباد
۱۲	خدا فراموشی اور رہبانیت: دو انتہا میں
۱۶	عبادت اور حقوق انسانی میں توازن
۱۸	انسانی حقوق اور شریعت میں فرق
۲۰	مغربی فلسفہ کی فکری بنیاد
۲۱	آسمانی تعلیمات سے انحراف
۲۲	یمن میں مصحف علومی کا اکتشاف
۲۴	ایرانی مجتہذ سے مولانا چنیوٹی کا مکالمہ
۲۷	دین کی حفاظت میں مدارس کا کردار
۳۰	قرآن و سنت کی تعبیر نو کا مسئلہ

### ☆ مغرب میں انسانی حقوق کا تاریخی پس منظر

۶۳-۳۳	اسلام میں حلال و حرام کی اتحارثی
۳۶	پاپائیت اور خلافت میں فرق
۳۸	

۳۹	خلافت اور امامت میں بنیادی فرق
۴۰	میکنا کارٹا، حقوق کی پہلی دستاویز
۴۱	عوام پر پوپ کے مذہبی مظالم
۴۲	مولوی کی اجارہ داری؟
۴۵	پوپ کے خلاف بغاوت
۴۸	انقلاب فرانس کا مرحلہ
۴۹	شریعت بل اور پارلیمنٹ کی خود مختاری
۵۱	سیکولر ازم کی دو بنیادیں
۵۲	دو پادری صاحبان سے گفتگو
۵۵	اقوام متحده کا انسانی حقوق کا چارٹر
۵۷	اقوام متحده کا قیام
۵۹	اقوام متحده اور اسلامی دنیا
۶۱	ہیومن رائٹس کے چارٹر کی بنیاد

## ☆ انسانی حقوق کا عالمی منشور اور اسلامی تعلیمات ۱۰۹-۶۳

۶۳	انسان کی عزت و تکریم
۶۵	آزادی ہر شخص کا حق ہے
۶۶	جان کی آزادی اور تحفظ
۶۶	غلامی کا مسئلہ
۷۱	امریکہ میں غلاموں کی منڈیاں
۷۲	غلامی کے بارے میں ہمارا موقف
۷۵	اسلام میں جرم و سزا کے قوانین
۷۷	اسلام اور بین الاقوامی عرف

۷۸	اسلام کا خاندانی نظام
۸۳	شادی میں مذہب کی شرط
۸۵	ولایت اور کفاءت کا مسئلہ
۸۷	میاں بیوی کے درمیان اختیارات کا توازن
۸۸	مغرب کا خاندانی نظام
۹۰	اسلام کا خاندانی نظام اور مغربی دانش ور
۹۱	عورت پر مغرب کا دو ہراظم
۹۲	عورت کو طلاق کا حق
۹۸	آزادی رائے اور آزادی مذہب
۹۹	گستاخان رسول اور مغرب
۱۰۱	ارتداد اور قادیانی مسئلہ
۱۰۳	قادیانی غیر مسلم کیوں ہیں؟
۱۰۶	اسلام کا سیاسی نظام
۱۰۷	خلافت اور امامت کا فرق
۱۰۹	خلاصہ بحث
۱۱۹-۱۱۱	☆ ضمیمه: انسانی حقوق کے عالمی منشور کا متن



بسم اللہ الرحمن الرحیم

## پیش لفظ

جامعہ انوار القرآن آدم ناؤں نا رکھ کر اپنی ملک کے بڑے تعلیمی اداروں میں سے ہے جو پاکستان شریعت کو نسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی دامت برکاتہم کے زیر اہتمام ایک عرصہ سے علمی، دینی اصلاحی اور دعویٰ خدمات سراج جام دے رہا ہے۔ پاکستان شریعت کو نسل کا ہیڈ کوارٹر بھی وہی ہے اور میری وقتاً فوقتاً وہاں حاضری ہوتی رہتی ہے۔ جامعہ انوار القرآن کے شعبہ شخص اور دارالاوقاء کے سربراہ مولانا مفتی حماد اللہ وحید حفظہ اللہ تعالیٰ ایک باذوق اور باہمت عالم دین ہیں۔ ان کی ہمیشہ خواہش بلکہ اصرار رہتا ہے کہ میں جب بھی انوار القرآن میں آؤں، شخص کے طلبہ کے ساتھ نشست میں کسی نہ کسی موضوع پر ان سے ضرور بات کروں اور میں بحمد اللہ تعالیٰ ان کے اس ارشاد کی حتی الوع قبولیں بھی کرتا ہوں۔

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں سہ ماہی امتحان کی تعطیلات کے موقع پر ۱۸ تا ۲۱ فروری ۲۰۰۸ء کو تین چاروں کے لیے جامعہ انوار القرآن میں حاضری ہوئی تو مفتی حماد اللہ وحید نے پروگرام کو وسعت دے کر دیگر بہت سے مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کو بھی شامل کر لیا اور مسلسل کئی نشتوں میں ان کے سامنے اقوام متحده کے انسانی حقوق کے چاروں کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کو جو مجموعی طور پر کم و بیش آٹھ نو گھنٹوں پر مشتمل ہے، مفتی صاحب موصوف نے آڑیوں ریکارڈنگ کے ذریعے ہی ہی پر محفوظ کر لیا، جبکہ میرے چھوٹے بیٹے ناصر الدین خان عامر سلمہ نے اسے ہی ہی سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے زیر نظر کتابچہ کی صورت میں مرتب کر دیا ہے جسے

نظر ثانی کے بعد زیر نظر کتاب پچھے کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

”انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات“، گزشتہ ربع صدی سے میری تحریر و تقریر کا اہم موضوع چلا آ رہا ہے اور جہاں بھی مناسب موقع ہوتا ہے، میں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور عرض کرتا ہوں۔ مگر میرے نزدیک یہ ابتدائی کاوش ہے جسے انسانی حقوق کی موجودہ عالمی صورت حال پر اسلامی تعلیمات کے حوالے سے تعارفی تبصرہ کہا جاسکتا ہے۔ اصل ضرورت اس موضوع پر تفصیلی علمی و تحقیقی کام کی ہے جس کا بار کوئی بڑا علمی ادارہ ہی اٹھا سکتا ہے اور میں اس کے لیے بہت سے بڑے بزرگوں کا دروازہ کھٹکھٹا چکا ہوں۔

شاید کہ اتر جائے کسی دل میں مری بات

قارئین سے درخواست ہے کہ ہمارے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ یہ حقیر سی کاوش قبول فرمائیں اور اسے کسی بہتر اور مفید علمی کام کا ذریعہ بنادیں۔ آمین یا رب العالمین

ابو عمار زادہ الراشدی

ڈائریکٹر ارشادیہ اکادمی، گوجرانوالہ

۱۲ اکتوبر ۲۰۱۱ء

## اسلام میں انسانی حقوق کا تصور

الحمد لله رب العالمين۔ والصلوة والسلام على سيد المرسلين۔  
وعلی آله وازواجہ واتباعہ اجمعین۔ اما بعد۔

حضرات طلبہ کرام!

یہ تین دن کا جو پروگرام ہے، اس میں گفتگو کا عنوان آپ حضرات کے علم میں ہو گا: "اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹ اور اسلامی تعلیمات"۔ آج دنیا میں انسانی حقوق کے اس اعلامیہ کے حوالہ سے بہت سے علمی، فلکری، دینی مسائل چل رہے ہیں اور ایک غزوہ فلکری، ایک نظریاتی جنگ جاری ہے جس کو ثقافتی جنگ بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ سولائیشن وار ہے۔ اس کو عقیدے کی جنگ بھی کہہ دیتے ہیں۔

اس وقت جو غزوہ فلکری مسلمانوں اور مغرب کے درمیان ہے، اس کی بنیاد اقوام متحدہ کے اس چارٹ پر ہے۔ اس کے حوالے سے اسلام کے بہت سے احکام و قوانین پر اعتراضات کیے جاتے ہیں اور ان اعتراضات کے ذریعے سے دنیا میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا راستہ روکا جا رہا ہے اور ان کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ مخالفت کرنے والوں میں غیر مسلم طاقتیں تو ہیں ہی، بہت سے مسلمان حلقے جو مسلمان امت میں ہیں، مسلمان ممالک میں رہتے ہیں، وہ بھی اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ مسلم ممالک میں اسلامی احکام و قوانین کا نفاذ نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی مخالفت کی بنیاد بھی اقوام متحدہ کا یہی چارٹ ہے، اس لیے میں اہل علم سے یہ گزارش کیا کرتا ہوں کہ

اس کا پس منظر، اس کی نوعیت اور اس کی تفصیلات ہمیں معلوم ہوئی چاہئیں کہ ہمارا مغرب کے ساتھ فکری معرکہ اور ثقافتی جنگ کیا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے، اس کا پس منظر کیا ہے اور اس کا پیش منظر کیا ہے۔ یہ گفتگو کا ایک مستقل موضوع ہے۔ جب علماء، اساتذہ اور طلبہ سے بات ہوتی ہے تو میں یہ گفتگو اکثر کیا کرتا ہوں۔ میرا زیادہ تر موضوع گفتگو انسانی حقوق کے نام پر جاری یہ جنگ ہی ہوتی ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ رب العزت کچھ حق کی باتیں کہنے سننے کی توفیق عطا فرمائیں۔ دین حق کے حوالے سے اور حق کے حوالے سے جو باتیں علم میں آئیں، سمجھ میں آئیں، اللہ تعالیٰ ان پر عمل کی اور اس مقصد کی خدمت کی توفیق بھی نصیب فرمائیں۔

### انسانی حقوق کا اسلامی فلسفہ

یہ جنگ انسانی حقوق کے نام سے لڑی جاری ہے۔ بنیادی موضوع ہیمن رائٹس کا ہے۔ اس گفتگو میں پہلے ہم یہ سمجھیں گے کہ اسلام میں حقوق کا تصور کیا ہے۔ اس کے بعد ہم آج کی دنیا میں انسانی حقوق کے تصور پر بات کریں گے۔ پھر ہم اقوام متحده کے اس چارٹر پر بحث کریں گے کہ کون کون سی جگہ پر اسلامی تعلیمات کے ساتھ اس کا مکارا ہے۔

سب سے پہلے میں واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ انسانی حقوق کا ہمارا تصور کیا ہے اور مغرب کا تصور کیا ہے۔ انسانی حقوق ہمارے ہاں بھی ہیں۔ قرآن کریم نے بھی حقوق بیان کیے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بڑی تفصیل کے ساتھ اس پر بات کی ہے۔ آپ کو میسیوں احادیث میں حقوق کا تذکرہ ملے گا، بلکہ شمار کیا جائے تو سیکروں تک جا پہنچیں گی۔

ایک فرق تو اصطلاح کا ہے۔ ہمارے ہاں حقوق کا لفظ دو حوالوں سے بولا جاتا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ لکل ان یا صطلح۔ ہر ایک کی اپنی اصطلاح ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اصطلاح حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ہے۔ آپ کو قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابوں میں سیکروں نہیں، ہزاروں صفحات میں گے جن میں حقوق اللہ اور حقوق العباد پر بحث کی گئی ہے۔ مغرب کی اصطلاح ہیمن رائٹس (انسانی حقوق) کی ہے۔ مغرب حقوق اللہ پر کوئی بات نہیں کرتا، صرف حقوق العباد

پربات کرتا ہے اور وہ بھی باہمی حقوق پر۔

ہمارا حقوق کا تصور کیا ہے؟ قرآن کریم کی مختلف آیات میں حق کا لفظ بولا گیا ہے۔ بنیادی طور پر حق کے دو معنی ہیں۔ ایک حق ہے باطل کے مقابلے پر۔ وَلَا تَبْلِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرہ: ٢٢) یہاں حق کا لفظ باطل کے مقابلے پر ہے۔ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (بنی اسرائیل: ٨١) یہاں بھی حق، باطل کے مقابل کے معنی میں ہے۔ وَكَذَبَ بِهِ قَوْمٌ وَهُوَ الْحَقُّ (الانعام: ٦٦) ایک جگہ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ: ٥) کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح اور آیات بھی ہیں جن میں حق اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حق کا دوسرا مطلب باہمی حقوق یعنی ایک فرد پر دوسرے فرد کے حق کے حوالے سے ہے۔ مثلاً: وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومُ (الذاریات: ٥١) ایک جگہ ہے: وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمُسْكِينُونَ وَأَبْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَدِّرْ تَبَدِّيرًا (بنی اسرائیل: ٢٦)۔ درج ذیل آیات میں بھی لفظ حق، انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ إِنْ تَرَكْ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ  
لِلِّوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبَيْنِ بِالْمَعْرُوفِ حَقًا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (البقرہ: ١٨٠)  
عَلَى الْمُوْسِعِ قَدْرَهُ وَعَلَى الْمُقْتَرِ قَدْرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًا عَلَى  
الْمُحْسِنِيْنَ (البقرہ: ٢٣٦)

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (البقرہ: ٢٣١)  
كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَأَتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (الانعام: ٦١)

ان آیات میں حق کا لفظ باہمی حقوق کے حوالے سے استعمال ہوا ہے۔ گویا قرآن کریم میں حق کا لفظ باطل کے مقابلے میں بھی استعمال ہوا ہے اور باہمی حقوق کے حوالے سے بھی۔ قرآن کریم نے جہاں حقوق العباد کا ذکر کیا ہے، وہی حقوق اللہ کا بھی ساتھ دکر کیا ہے۔ مثلاً میں دو مقامات کی

نشان دہی کروں گا جہاں اللہ رب العزت نے حقوق العباد اور حقوق اللہ کا اکٹھا ذکر کیا ہے۔ فرمایا:

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي  
الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ  
وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكْتُ أَيْمَانُكُمْ (السَّاءِ: ۳۶)

یہاں پہلا حق کس کا بیان ہوا ہے؟ وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا۔ اس کے بعد مال باپ کا، قربی رشتہ داروں، تیمبوں اور مسافروں کا ذکر ہے۔ اللہ کا بھی حق ہے اور بندوں کے بھی حقوق ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے: وَقَضَى رَبُّكَ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيمَانُهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ  
إِحْسَانًا (بنی اسرائیل ۷: ۲۳) اس آیت میں آگے اور لوگوں کے حقوق بھی بیان ہوئے ہیں۔ ایک جگہ ہے:

وَإِذْ قَالَ لُقَمَانَ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكُ بِاللَّهِ، إِنَّ الشَّرْكَ  
لَظُلْمٌ عَظِيمٌ، وَوَصَّيْنَا إِلِّيْسَانَ بِوَالِدِيهِ، حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهُنَّا عَلَى وَهُنِّ  
وَفِصَالَهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدِيْكَ، إِلَيَّ الْمَصِيرُ (لقمان: ۱۲، ۱۳)

تو یہ بات ذہن میں رکھیں کہ قرآن کریم نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا اکٹھے ذکر کیا ہے۔

## حقوق اللہ اور حقوق العباد

اسلام کا اس حوالے سے مزاج کیا ہے؟ یہ سمجھانے کے لیے میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

بنخاری شریف ( رقم: ۱۸۲۲) کی روایت ہے۔ بہت دلچسپ واقعہ ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ جب مدینہ منورہ آئے تو ایک یہودی خاندان کے غلام تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہی دنوں مدینہ پہنچ تھے۔ قبایں ان کی ملاقات ہوئی۔ حضرت سلمان فارسیؓ حق کی تلاش میں تھے۔ یہودی خاندان سے مکاتبت کر کے آزاد ہوئے۔ جب آزاد ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو اس وقت ان کی حیثیت مہاجر کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین والنصار کے درمیان مواخات کرائی تو حضرت سلمان فارسیؓ کو آپ نے حضرت ابو الدرداءؓ کا بھائی بنایا۔ سلمان فارسیؓ مہاجر تھے اور ابو الدرداءؓ انصاری تھے۔ اس وقت مواخات کی قانونی حیثیت تھی جس کے تحت بھائی

بھائی بننے والے وراثت میں بھی حقدار ہوتے تھے اور دیگر کئی حقوق میں بھی حصہ دار ہوتے تھے۔ بعد میں جب وراثت کے مستقل احکامات آئے تو مواخات کی قانونی حیثیت ختم ہو گئی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان دونوں کو بھائی بنادیا تو ابوالدرداء سلمان فارسیؓ کو اپنے ساتھ لے کر گھر گئے۔ سلمان فارسیؓ تو پرانے آدمی تھے۔ حافظ ابن حجر، حافظ ذہبیؓ کے حوالے سے ان کی کم سے کم عمر اٹھائی سو سال تھلاتے ہیں۔ (الاصابہ، ترجمہ رقم: ۳۳۵۸) کچھ روایات ساڑھے چار سو سال اور پانچ سو سال کی بھی ہیں۔ جب یہ سلمان ہوئے تو محتاط روایت کے مطابق تقریباً دو سو سال کی عمر کے تھے۔ سرد و گرم چشیدہ، جہاں دیدہ تھے۔ مختلف مذاہب کو بھگتے ہوئے تھے، مختلف خاندان بھگتے ہوئے تھے، مختلف علاقوں دیکھے ہوئے تھے۔ تجربہ کا راوی پرانے بزرگ تھے۔

ابوالدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ سلمان فارسیؓ جب گھر پہنچے تو دیکھا کہ گھر میں گھروالی کوئی بات نہیں ہے۔ ام الدداءؓ کو دیکھا کہ میلے کچلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، گھر کی کوئی صفائی نہیں ہے، کوئی ساتھ رہنے والا ماحول نہیں ہے۔ حالانکہ عورت گھر میں ہو تو گھر کی حالت سے پتہ چلتا ہے کہ اس گھر میں عورت رہتی ہے۔ وہ مکان کو صاف رکھی، پردے لٹکائے گی، زیب و زینت کا اہتمام کرے گی۔ یہ عورت کی فطرت ہے، عورت کا مزاج ہے کہ وہ خود بھی بنے سنوارے گی اور گھر کو بھی بنائے سنوارے گی۔ سلمان فارسیؓ نے جب دیکھا کہ گھر میں تو کوئی گھر کی بات نہیں ہے تو آتے ہی ام الدداءؓ سے پوچھ لیا کہ یہ اپنا اور اس گھر کا کیا حال بنارکھا ہے؟ آتے ہی انہوں یوکر لیا کہ یہ کیا تماشا ہے۔ ام الدداءؓ نے جواب دیا کہ بھائی جان، آپ کے بھائی کو کسی بات سے دلچسپی نہیں ہے۔ عورت بنتی سنورتی ہے، لیکن کسی کے لیے بنتی سنورتی ہے؟ یہ عورت کا مزاج بھی ہے اور اس کا حق بھی ہے، لیکن وہ بنتی سنورتی کسی کے لیے ہے۔ ام الدداءؓ نے جواب دیا کہ جس کے لیے بنانا سنورنا ہے اور اس گھر کی دیکھ بھال رکھنی ہے، اسی کو دلچسپی نہیں ہے تو میں کیا کروں؟ بس ٹھیک ہے، یہ بھی گزارا کر رہا ہے، میں بھی گزارا کر رہی ہوں۔ کہا کہ آپ کے بھائی کو کوئی حاجت نہیں کہ میں زیب و زینت کیے ہوئے ہوں یا اس گھر کی آرائش کر کے رکھوں۔

یہ پہلی بات تھی جو سلمان فارسیؓ نے اس گھر میں نوٹ کی۔ دو پھر کا وقت ہوا تو ابوالدرداءؓ نے

اپنے بھائی سلمان فارسی کے لیے دسترخوان بچھایا اور کھانا رکھا، لیکن خود وہ روزے سے تھے۔ حضرت ابوالدرداء بلا ناغہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ وہ دن کو روزہ کھتے تھے اور ساری رات قیام کرتے تھے۔ خود ہی سوچیے کہ پھر یوں کس کے لیے بنتی سنورتی! مہمان کے سامنے کھانا رکھا، لیکن خود روزے سے تھے۔ سلمان فارسی نے کہا کہ تم بھی کھاؤ۔ جواب دیا کہ میرا تو روزہ ہے۔ اب حضورؐ نے سلمان فارسیؐ کو ابوالدرداء کا صرف بھائی ہی نہیں بلکہ بڑا بھائی بنایا تھا۔ بڑے بھائی کا درکا تو آپ کے علم میں ہے۔ فارسی کا ایک مشہور محاورہ ہے: سگ باش، بر اور خورد مباش۔ مطلب یہ کہ چھوٹا بھائی کسی کا نہ بننا۔ چھوٹا بھائی ساری زندگی مصیبت میں رہتا ہے۔ لیکن یہ کسی کے اختیار میں بھی نہیں ہے، یہ تو اللہ کی تقسیم ہوتی ہے کہ پہلے کس کو دنیا میں بھیجی، بعد میں کس کو بھیجی۔ تو سلمان فارسیؐ بڑے بھائی تھے۔ کہا کہ بھائی! بیٹھو اور بیٹھ کر میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ جواب دیا کہ جی میرا تو روزہ ہے۔ سلمان فارسیؐ کہتے ہیں کہ بس ٹھیک ہے، یہ کھانا اٹھالو۔ میں بھی نہیں کھاتا۔ اب ابوالدرداء مہمان کے سامنے سے کھانا کیسے اٹھائیں؟ چنانچہ ابوالدرداءؐ کو روزہ توڑنا پڑا اور وہ سلمان فارسیؐ کے ساتھ کھانے پر بیٹھ گئے۔

مسئلہ بھی یہی ہے۔ یاد رکھیں کہ ہماری اسلامی تعلیمات کا یہ اصول ہے کہ فرائض میں حقوق اللہ مقدم ہیں اور فرائض کے علاوہ نوافل، مستحبات اور مباحات میں حقوق العباد مقدم ہیں۔ یعنی فرائض اور واجبات میں حقوق اللہ مقدم ہیں، لیکن باقی سب معاملات میں حقوق العباد مقدم ہیں۔ فقهاء یہ مسئلہ لکھتے ہیں کہ مہمان کے اکرام کے لیے اگر اس کا اصرار ہو تو آپ نقلی روزہ توڑ دیں گے، مہمان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوں گے اور بعد میں اس روزہ کی قضا کریں گے۔ چنانچہ ابوالدرداءؐ نے روزہ توڑ دیا اور ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ رات ہوئی تو عشا پڑھی، بستر بچھایا۔ ابوالدرداءؐ کہتے ہیں کہ بھائی جان، آپ تو آرام فرمائیں۔ پوچھا تمہارا کیا پروگرام ہے؟ کہا، میں تورات کو قیام کرتا ہوں۔ سلمان فارسیؐ کہتے ہیں کہ بھی، اپنا بستر لاو۔ ابوالدرداءؐ کہنے لگے کہ جی میں نے تو اپنے نوافل پڑھنے ہیں۔ سلمان فارسیؐ کہتے ہیں کہ نہیں بھی، اپنا بستر لاو اور سوجاؤ۔ ابوالدرداءؐ خود کہتے ہیں کہ میں یہ سوچ کر لیت گیا کہ جب سلمان فارسیؐ سو جائیں گے تو میں انھوں کراپنا کام کروں۔

گا۔ سلمان فارسی بھی سوئے نہیں تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ابوالدرداء اٹھے تو سلمان فارسی نے پوچھا، کدھر جا رہے ہو؟ آرام سے سو جاؤ۔ اب ابوالدرداء سو گئے۔

جب رات کا پچھلا پھر ہوا تو تہجد کے وقت سلمان فارسی خود بھی اٹھے اور ابوالدرداء کو بھی اٹھایا کہ اٹھو بھی، اب نماز کا وقت ہے۔ تم بھی پڑھو اور میں بھی پڑھتا ہوں۔ دونوں تہجد پڑھ کر فارغ ہوئے تو فیصلہ کیا کہ چلو فجر کی نماز مسجد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھتے ہیں، لیکن جاتے ہوئے سلمان فارسی نے ایک جملہ کہا۔ بس یہ جملہ ہمارے حقوق کے تصور کی بنیاد ہے۔ میں نے آپ کی خدمت میں یہ سارا پس منظر اس لیے بیان کیا ہے کہ آپ کو یہ جملہ سمجھ میں آجائے۔ ہماری اسلامی تعلیمات میں حقوق کے تصور کی بنیاد سلمان فارسی کا یہ جملہ ہے۔ فرمایا:

ان لربک عليك حقاً، ولنفسك عليك حقاً، ولأهلک عليك حقاً،  
(وفی روایة: ولزورک عليك حقاً)، فأعط كل ذی حق حقه۔

(بخاری، رقم ۱۹۶۸)

”مشیرے رب کے بھی تجھ پر حق ہیں، تمہارے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے، آنے جانے والے مہمانوں کا بھی تجھ پر حق ہے، پس ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔“

تو اسلام میں حقوق کا تصور کیا ہے؟ اعط کل ذی حق حقہ کہ ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔ اللہ کا حق اللہ کے وقت میں، بیوی کا حق بیوی کے وقت میں، آنکھوں کا حق آنکھوں کے وقت میں، مہمان کا حق مہمان کے وقت میں اور اسی طرح باقی لوگوں کے حقوق ان کے مطابق۔ سلمان فارسی نے یہ کہا اور پھر دونوں مسجد کی طرف چل نکلے۔ مسجد پہنچ کر نماز پڑھی۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حسب معمول لوگوں سے پوچھنے لگے کہ بھی، تمہارا کیا حال ہے، تمہارا کیا حال ہے؟ ابوالدرداء کہتے ہیں کہ مجھ سے آپ نے پوچھا کہ ہاں بھی، تم نے اپنے بھائی کو کیا پایا؟ ابوالدرداء تو بھرے بیٹھے تھے، ساری کارگزاری سنادی کہ یا رسول اللہ! میرا روزہ بھی تزوادیا، بیوی سے بھی انٹرویو کرتے رہے، رات کو نفل بھی نہیں پڑھنے دیے اور اب آتے وقت یہ نصیحت کر کے آگئے ہیں۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک

جملہ فرمایا: صدق سلمان، سلمان نے جو کہا، سچ کہا۔

## خدا فراموشی اور رہبانیت: دو انتہائیں

میں نے عرض کیا کہ حقوق کے اسلامی تصور میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ہیں۔ اسلام ان دونوں کو الگ الگ نہیں کرتا، بلکہ ان دونوں میں ترجیح و تقدیم بھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ فرائض و واجبات میں ترجیح و تقدیم حقوق اللہ کی ہے اور نوافل، مستحبات اور مباحات میں ترجیح حقوق العباد کی ہے۔ مغرب کے ساتھ ہمارا ایک تنازعہ تو یہ ہے کہ مغرب حقوق اللہ کو بالکل نظر انداز کرتا ہے۔ ان کے ہاں اللہ کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان کے خیال میں پہنچنیں اللہ ہے بھی یا نہیں۔ مغرب میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد خدا پر یقین نہیں رکھتی۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو سرز میں عرب میں دو انتہائیں تھیں۔ ایک طرف رہبانیت کے نام پر حقوق اللہ کا یہ تصور تھا کہ دنیا ہی چھوڑ دی جائے۔ رہبانیت سے مراد یہ ہے کہ دنیا سے قطع تعلق کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں اکیلے زندگی گزارو اور بس۔ یہ حقوق اللہ کا غلبہ تھا کہ بس اللہ کی بندگی کرو، ذکرا ذکار کرو، بیوی بچوں وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن کریم نے اس تصور کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ:

وَرَهْبَانِيَةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَا هَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا

رَعَوْهَا حَقٌّ رِعَايَتِهَا (الحدیڈ: ۵۷)

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے متعدد ارشادات میں واضح طور پر رہبانیت کے تصور کی نفی فرمائی ہے۔ احادیث میں آپ کو اس سلسلے میں بہت سے واقعات ملیں گے۔ میں اس وقت صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کروں گا۔

عبداللہ ابن عمر راوی ہیں۔ ایک موقع پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ نے، جن میں عبد اللہ ابن عمر بھی تھے، آپس میں مشورہ کیا کہ حضورؐ کے گھر کے باہر کے معمولات تو ہمارے علم میں ہیں۔ آپ نماز پڑھتے ہیں، وعظ فرماتے ہیں اور جہاد پر جاتے ہیں، لیکن چار

دیواری کے اندر کے معمولات ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ مشورہ کیا کہ ہمیں یہ بھی معلوم کرنے چاہئیں اور پھر ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ ان کا تصور شاید یہ تھا کہ حضور گھر میں داخل ہو کر مصلے پر کھڑے ہو جاتے ہوں گے اور پھر وہیں سے باہر آ جاتے ہوں گے۔ انہوں نے طے کیا کہ ازواج مطہرات سے حضور کے گھر کے اندر کے معمولات کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ حضور کے ایک گھر کے باہر کھڑے ہو کرام المؤمنین سے پوچھاتو انہوں نے جواب دیا کہ حضور کے گھر کے معمولات وہی ہوتے ہیں جو عام طور پر دوسرے مردوں کے ہوتے ہیں۔ ہمارا حال احوال پوچھتے ہیں، گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کرتے ہیں، سودا سلف بھی خرید کر لاتے ہیں، آرام بھی کرتے ہیں، میاں بیوی کے حقوق کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور رات کے وقت نماز بھی پڑھتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں کہ: كَأَنْهُمْ تَقَالُوْهَا۔ ان حضرات نے ان معمولات کو اپنے تصور سے بہت کم سمجھا کہ ہم تو کچھ اور سمجھتے تھے، حضورؐ کو گھر کے اندر بالکل عام زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے خود ہی اس کی توجیہ بھی کر لی کہ حضورؐ کو اس کی ضرورت بھی کیا ہے، اللہ نے ویسے ہی آپ کی مغفرت کا اعلان فرمائ کھا ہے:

لِيَغُفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقدَّمَ مِنْ ذَنبِكَ وَمَا تَأْخَرَ وَيُتَمَّ نِعْمَةُ عَلَيْكَ

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا (الفتح: ۲۸)

سوچا کہ ہم تو بہر حال امتی ہیں، ہمیں تو ضرورت ہے۔ چنانچہ آپس میں بیٹھ کر اپنے معمولات طے کر لیے۔ ایک نے کہا کہ میں ساری عمر روزے رکھوں گا۔ ایک نے فیصلہ کر لیا کہ میں ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔ ایک نے طے کر لیا کہ ساری زندگی رات کے وقت قیام کروں گا، سوؤں گا نہیں۔ ان حضرات نے آپس میں عبادت کے نقطہ نظر سے یہ باتیں طے کر لیں۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا۔ آپ نے انہیں بلا لیا۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ ہمیں شباب اش ملے گی کہ ہم نے اتنا اچھا کام کیا، لیکن جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے برعکس یہ فرمایا کہ: انی لاخشا کم لله و اتقا کم له۔ میں تم سب سے سے زیادہ خوف خدار کھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ تقوی رکھتا ہوں۔ اس کا دوسرے لفظوں میں معنی کیا جائے تو

مطلوب یہ بتا ہے کہ کیا ایسا کرنے سے تم لوگ مجھ سے زیادہ متقی ہو جاؤ گے؟ مجھ سے زیادہ خدا خونی آجائے گی تم لوگوں میں؟ انی لاجھشاکم اللہ و اتقاکم لہ۔ میں تم سے زیادہ خوف خدار کھتا ہوں اور تم سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہوں۔ بھی، میں نے شادی بھی کی ہے، بلکہ شادیاں کی ہیں۔ حضورؐ کی شادیاں تو ایک مستقل موضوع ہے۔ لوگ اس پر بہت اعتراض کرتے ہیں۔ خیر، وہ ایک الگ موضوع ہے۔ فرمایا کہ میرے بچے بھی ہیں، کھاتا بھی ہوں، سوتا بھی ہوں، بیویوں کے پاس بھی جاتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، کبھی روزہ رکھتا ہوں، کبھی نہیں رکھتا۔ بھی میں تو سارے کام کرتا ہوں، کوئی بھی ضروری کام ترک نہیں کرتا۔ یہ فرمائے حضورؐ نے ایک جملہ فرمایا: فمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنْتِي فَلِيْسْ مِنِيْ - جس نے میری سنت سے اعراض کیا، اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ (بخاری، رقم ۵۰۶۳) اس جملے کا پس منظر یہ سارا واقعہ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن قائم رکھنا میری سنت ہے، جس نے میری سنت سے اعراض کیا، اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

## عبدات اور حقوق انسانی میں توازن

رسرا واقعہ عبد اللہ بن عمر وابن العاصؓ کا ہے۔ وہ خود واقعہ سناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے والد صاحب نے میری شادی کر دی اور الگ مکان دے دیا کہ جاؤ، وہاں جا کر رہو۔ عمر وابن العاصؓ بہت ذہین آدمی تھے۔ دھاۃ عرب میں سے تھے۔ جریل بھی تھے اور عرب دنیا کے چوٹی کے تین چار ڈپلومیٹس میں سے تھے۔ والد صاحب دو چاروں کے بعد آئے کہ بیٹے کا حال احوال پوچھوں۔ بیٹا گھر پر نہیں تھا، بہوت تھی۔ پوچھا بیٹی کیا حال ہے؟ کہا، ٹھیک ہے۔ خاوند کیسا ہے؟ کہا، بہت نیک ہے۔ پوچھا، تم خوش ہو؟ کہا، جی خوش ہوں۔ آپ کا بیٹا بہت اچھا ہے، ساری رات مصلے پر ہوتا ہے اور سارا دن روزے سے رہتا ہے۔ خاوند کی یہ تعریف اس کی بیوی کر رہی ہے۔ لم یفتش لنا کنفا ولم یعرف لنا فراشا۔ ہمارے لیے اس نے ابھی تک کوئی کونہ تلاش نہیں کیا۔ بس اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ عمر وابن العاصؓ مجھے گئے کہ یہ تعریف نہیں، بلکہ شکایت ہے۔ عمر وابن العاصؓ اپنے بیٹے کا مزاج سمجھتے تھے، چنانچہ خود اس سے بات کرنے کی بجائے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ معاملہ پیش کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے عبد اللہ کی شادی کی ہے اور وہ ساری رات نفلوں میں ہی لگا رہتا ہے۔

حضورؐ نے بلالیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور نے بلالیا اور ایک روایت میں ہے کہ خود حضورؐ میرے گھر تشریف لے آئے۔ عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے پوچھا، ہاں بھی؟! کتنی عبادت کرتے ہو؟ کہا کہ ساری رات۔ آپؐ نے فرمایا، نہیں بھی، یہ بھیک نہیں ہے۔ فرمایا: ثلث لیل، زیادہ سے زیادہ رات کا تیرا حصہ۔ یوں کا بھی تجھ پر حق ہے، جسم کا بھی حق ہے۔ پھر پوچھا، تمہارے روزوں کی کیا ترتیب ہے؟ کہا، یا رسول اللہ! مسلسل روزے رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، بس مہینے میں تین روزے کافی ہیں۔ عبد اللہؓ کہتے ہیں، یا رسول اللہ! تین تو تھوڑے ہیں۔ فرمایا، سات کرو۔ عبد اللہؓ نے کہا، یہ بھی تھوڑے ہیں۔ فرمایا، پھر دس کرو۔ کہا، یہ بھی تھوڑے ہیں۔ فرمایا، اچھا پندرہ کرو۔ لا صیام افضل من صوم داؤد۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے سے افضل کوئی روزہ نہیں ہے۔ داؤد علیہ السلام کا معمول یہ تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن ناغہ کرتے تھے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن عمرؓ سے پوچھا، تمہارا قرآن کریم کا معمول کیا ہے؟ کہا، یا رسول اللہ! روزانہ مکمل قرآن کریم پڑھتا ہوں۔ فرمایا، مہینے میں پورا پڑھ لیا کرو۔ کہا، یہ تو بہت کم ہے۔ فرمایا، اچھا پندرہ دن میں پڑھ لیا کرو۔ کہا، یہ بھی تھوڑا ہے۔ فرمایا، اچھا دس دن میں پڑھ لیا کرو۔ کہا، یہ بھی کم ہے۔ فرمایا، اچھا سات دن میں پڑھ لیا کرو۔ اس سے زیادہ نہیں۔

عبد اللہ بن عمرؓ حضورؐ کے وصال کے بعد کافی عرصہ حیات رہے ہیں۔ اپنے بڑھاپے میں کہتے ہیں کہ میں اس وقت جوانی کے جوش میں تھا اور یہ اصرار میرا تھا کہ پندرہ روزے مہینے میں رکھوں گا اور قرآن کریم سات دنوں میں پڑھوں گا۔ عبد اللہؓ خود کہتے ہیں کہ اس وقت تو جوانی کے جوش میں، میں نے یہ ساری باتیں کر لیں۔ اب بڑھا ہو گیا ہوں تو خیال آتا ہے کہ: یہ لیتنی قبلت رخصة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کاش میں نے حضورؐ کی دی ہوئی رخصت قبول کر لی ہوتی۔ اب چونکہ یہ بات میں نے حضورؐ کے ساتھ کی تھی، اس لیے اب پوزی

کرنی پڑ رہی ہے، لیکن اب میری ہمت اور طاقت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ حضورؐ کی تجویز کہ مہینے میں ایک قرآن پڑھ لواور مہینے میں تین روزے رکھلو، میں نے قبول کر لی ہوتی تو اچھا تھا۔ (مذکورہ واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مند احمد، تحقیق: احمد شاکر، رقم ۷۷۲۔ صحیح بخاری، رقم ۱۹۷۵)

## انسانی حقوق اور شریعت میں فرق

میں ایک بات عرض کیا کرتا ہوں، اسے بطور اصول کے ذہن میں رکھیں۔ انسان جب بھی اپنے بارے میں فیصلہ کرتا ہے، وقتی حالات کے تحت کرتا ہے۔ وہ انسان ایک آدمی ہو، پارٹی ہو، پارلیمنٹ ہو یا سوسائٹی ہو، انسان اپنا فیصلہ معروضی حالات کے تحت کرتا ہے۔ پارلیمنٹ بھی کوئی فیصلہ کرے گی تو معروضی حالات کے مطابق کرے گی اور سوسائٹی بھی اگر کوئی فیصلہ کرتی ہے تو معروضی حالات کے مطابق کرتی ہے۔ جبکہ شریعت انسان کے معروضی حالات اور مستقبل دونوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتی ہے۔ اللہ کو تو پتہ ہے کہ آگے کیا ہونا ہے۔ ایک آدمی نے بوڑھا بھی ہونا ہے۔ ابھی تو یہ تیس سال کا جوان ہے، سب کچھ کر لے گا۔ جب یہ اسی (۸۰) سال کا ہو گا تو پھر کیا کرے گا؟ شریعت جب بھی فیصلہ کرتی ہے تو حال اور مستقبل دونوں کے حالات کو سامنے رکھ کر کرتی ہے۔ اس لیے شریعت کا ضابطہ ہی مقدم ہے۔ سمجھ میں آئے، تب بھی مقدم ہے۔ نہ سمجھ میں آئے، تب بھی مقدم ہے۔ بسا اوقات شریعت کا ضابطہ ذرا دیر سے سمجھ میں آتا ہے۔ عبداللہ ابن عمر و ابن العاصؓ کو بھی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تلقین فرمائی کہ نہیں بھی، اتنی تختی تھیک نہیں ہے۔ بیوی کا بھی حق ہے، بچوں کا بھی حق ہے، گھر کا بھی حق ہے، جسم کا بھی حق ہے۔

یہ دو واقعات ذکر کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ حضورؐ نے سوسائٹی میں حقوق کے حوالے سے توازن قائم کیا ہے۔ ایک طرف حقوق اللہ کی بات تھی اور رہبانیت تھی۔ بس اللہ کی بندگی کرنی ہے اور دنیا و مافیہا کو چھوڑ دینا ہے۔ حضورؐ نے اس کی نفی کی ہے۔ دوسری طرف کیا تھا؟ کَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ (الحضر ۱۹: ۵) خدا کو بھول گئے کہ خدا بھی ہے، اس کا بھی کوئی حق ہمارے ذمے ہے۔ یہ ایک دوسری انتہا تھی۔ اس وقت کے جاہلیت کے زمانے میں بھی تھی اور آج کے جاہلیت کے زمانے میں بھی ہے۔ آج بھی اسی جاہلیت سے ہمارا سامنا ہے کہ اس سے

خدا کا تو کچھ نہیں بگزتا۔ آپ کے حقوق ادا نہیں کریں گے تو ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں گے، لیکن خدا کے حق ادا نہیں کریں گے تو اس سے خدا کو تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ فَمَا أَكَارَ  
لِشَرِّكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَى شَرَكَائِهِمْ سَاءَ مَا  
يَحْكُمُونَ (الانعام ۶: ۱۳۶) یعنی خدا کا حق دوسروں کی طرف چلا بھی جائے تو کیا ہے۔ وہ تو  
غُنی ہے، لیکن وہ دوسروں کا حق خدا کی طرف نہیں جانے دیتے تھے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا  
توازن قائم کیا اور یہ بتایا کہ حقوق اللہ کی بنیاد پر حقوق العباد کی نفی نہیں ہوگی اور حقوق العباد کی بنیاد  
پر حقوق اللہ کی نفی نہیں ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم نے جہاں حقوق کا تذکرہ کیا ہے، ان  
دونوں حقوق کا کیا ہے۔ آپ نے حقوق کا توازن قائم کیا اور بتایا کہ اس کا نام اسلام ہے۔ تو  
مغرب کے حقوق کے فلسفے میں اور ہمارے حقوق کے فلسفے میں ایک بنیادی فرق تو یہ ہے۔

### مغربی فلسفہ کی فکری بنیاد

دوسرافرق مغرب کے فلسفے میں اور اسلام کے فلسفے میں یہ ہے کہ مغرب جو کچھ بھی طے کرتا  
ہے، سوسائٹی کے حوالے سے طے کرتا ہے اور اسلام جو بھی طے کرتا ہے، وحی کے حوالے سے طے  
کرتا ہے۔ ہماری بنیاد وحی پر ہے اور مغرب کی بنیاد سوسائٹی پر ہے۔ یہ دونوں میں ایک بہت بڑا  
فرق ہے۔ اسلام اور مغرب کے سارے جھگڑے کی بنیاد تقریباً بھی ہے۔ اس پر میں ایک مثال  
عرض کرنا چاہوں گا۔ یہ بھی ہمارا ایک مستقل جھگڑا ہے کہ معاملات کس بنیاد پر طے کریں گے۔  
سوسائٹی کی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر یا جو وحی کہے گی، اس کی بنیاد پر۔ ہماری بنیاد تو اس پر ہے کہ:

وَأَنَّ الْحُكْمَ يَبْيَثُهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعُ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرُهُمْ أَنْ

يَفْتَنُوكَ عَنِ بَعْضٍ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ (المائدہ ۵: ۳۹)

لوگوں کے درمیان معاملات بما انزل اللہ کی بنیاد پر طے کریں اور سوسائٹی کیا چاہتی  
ہے، اس کی پیروی نہ کریں۔ ایک فرق میں ذرا واضح کر دوں کہ لا تتبع اهواء هم کی بھی حد

ہے۔ کیا سوسائٹی کی ہر خواہش کی ہم نفی کر دیں گے؟ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ لا تَتَبَعَ أَهْوَاءَ هُنْمَانِ (الْمَائِدَةِ: ۳۸) مطلب یہ نہیں کہ قرآن نے سوسائٹی کی ہر خواہش کی نفی کر دی ہے۔ سوسائٹی کی اکثریت کی ہر خواہش رد ہو جائے، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ سوسائٹی کی جو خواہش حق کے مقابلے پر ہوگی، وہ رد کر دی جائے گی۔

لَا تَتَبَعَ أَهْوَاءَ هُنْمَانِ (الْمَائِدَةِ: ۳۸) فقہی اصطلاح میں ہم یوں کہتے ہیں کہ منصوصات کے مقابلے میں سوسائٹی کی خواہشات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہاں اگر منصوصات کے خلاف کوئی خواہش نہیں ہے تو ثہیک ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ سوسائٹی کی کوئی بات مانی ہی نہیں۔ بدستمی سے ہم بھی اس مقابلے میں دوسری انتہا پر چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے خود یہ حد بیان کر دی کہ آپ کے پاس جو وحی آگئی، جو نصوص قطعیہ آگئیں، ان معاملات میں سوسائٹی کی خواہشات کی پیروی نہیں ہوگی۔ اگر سوسائٹی قرآن و سنت کے کسی فیصلہ کے مقابلے پر آتی ہے تو اس کی بات رد ہو جائے گی، باقی جو معاملات ہیں ان میں سوسائٹی کا حق ہے، وہ جیسے چاہے کرے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ کچھ عرصہ پہلے ڈنمارک سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت پر مشتمل خاکے چھپے تھے۔ اس پر دنیا میں ایک لمبی بحث چلی تھی۔ اس مباحثے میں مغربی دانشوروں نے بہت کچھ لکھا۔ میں اس بحث کے حوالے سے اس واقعہ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ جس جریدہ نے یہ کارٹون چھاپے تھے، اس کے ایڈیٹر فلینگ روز نے اپنی وضاحت میں بہت کچھ لکھا کہ میں نے ثہیک کیا ہے اور آئندہ بھی کروں گا اور پھر دوبارہ بھی اس نے یہ کیا۔ اس موقع پر ایک مغربی دانش ور نے لکھا کہ ہم میں اور مسلمانوں میں دو بنیادی فرق ہیں۔ ایک فرق یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی بالغ ہو گئی ہے۔ مغرب والے کہتے ہیں کہ نابالغ بچے کو باپ کی انگلی پکڑنے کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ بالغ بچے کو نہیں۔ جب سوسائٹی نابالغ تھی، تب ہم آسمانی تعلیمات کی پیروی کرتے تھے۔ اب سوسائٹی بالغ اور عقلمند ہو گئی ہے، اب یہ خود فیصلے کرے گی۔ اسے کسی کی ڈکٹیشن کی ضرورت نہیں ہے۔ مغرب کہتا ہے کہ ہم نے آزاد ہن سے فیصلے کرنے شروع کر دیے ہیں، ہم نے خدا، رسول اور بابل کا حوالہ ذہنوں سے اتار دیا ہے۔ ہم کوئی قانون بناتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ خدا کیا کہتا ہے، کوئی فیصلہ کرتے وقت ہم یہ نہیں دیکھتے کہ Jesus (عیسیٰ) نے اس بارے میں کیا کہا۔ ہم

کوئی ضابطہ بناتے وقت بائبل سے نہیں پوچھتے کہ بائبل اس بارے میں کیا کہتی ہے۔ ہم نے یہ حوالے چھوڑ دیے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے ابھی تک خدا، رسول اور قرآن کا حوالہ اپنے ذہنوں سے چھینایا ہوا ہے۔ ان سے جب بات کرو، کہتے ہیں کہ خدا نے یہ کہا ہے۔ کسی مسئلے پر بحث کرو، کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ لکھا ہے۔ کسی عنوان پر بات کرو تو کہتے ہیں کہ محمد نے یہ کہا ہے۔ یہ مغربی دانش و رکھتا ہے کہ بھی چھوڑ واں قصے کو۔ آزاد ذہن سے فیصلے کرو۔

آپ حضرات یہ بات پوری طرح سے سمجھ لیں، کیونکہ یہی اصل جھگڑے کی بنیاد ہے۔ اس مغربی دانش و رکھتے ہیں کہ اور ہم اس پر الحمد للہ ثم الحمد للہ ثم الحمد للہ کہتے ہیں، کیونکہ مسلم سوسائٹی کی تمام تر خرابیوں کے باوجود آج بھی یہ کیفیت ہے کہ ہمارے ذہنوں میں خدا اور رسول کا حوالہ قائم ہے۔ ہمارے معاشرے میں اگر کسی کو قرآن کے خلاف بھی بات کرنی ہے تو حوالہ کہاں سے ڈھونڈ کر لائے گا؟ قرآن سے ہی لائے گا۔ سنت کے خلاف کوئی بات کرے گا تو حوالہ کس کا دے گا؟ سنت کا ہی دے گا۔ آج بھی مسلم معاشرے میں قرآن و سنت کے حوالے سے ہٹ کر کوئی بات کہنا ممکن ہی نہیں ہے۔ کوئی سننے کو تیار نہیں ہے۔ مسلم معاشرے میں اگر کسی نے کوئی بات کرنی ہے تو اسے قرآن سے کوئی آیت تلاش کرنی پڑے گی یا حدیث کا کوئی ٹکڑا ڈھونڈ کر لانا پڑے گا۔ ہمارے ہاں بڑی خرابیاں ہیں، بڑی کوتاہیاں ہیں، بڑی بدلی ہے، لیکن الحمد للہ آج بھی ہمارے ہاں یہ حوالہ قائم ہے، جبکہ مغرب کے لیے یہی حوالہ پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔

میں مغرب والوں سے تحدی کے طور پر دو باتیں کہا کرتا ہوں۔ میں مثال دے کر یہ واضح کروں گا۔ میں مغرب والوں سے کہتا ہوں کہ دنیا میں کہیں بھی، کسی کونے میں، راستے میں چلتے ہوئے کسی مسلمان کو روک لو اور اس سے ایک سوال کرو کہ قرآن کریم نے یہ بات کہی ہے جبکہ آج کی سائنس اور فلسفہ، آج کی اقوام متحده یا آج کی سوسائٹی یہ بات کہتی ہے، تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ حضرات کے خیال میں اس مسلمان کا جواب کیا ہو گا؟ وہ مسلمان دونوں جواب دے گا کہ قرآن کی بات ٹھیک ہے، چاہے اسے مسئلے اور دلائل کا کچھ پتہ نہ ہو۔ اسی طرح دنیا کے کسی مسلمان سے کہو کہ محمد رسول اللہ نے یہ بات (نعوذ باللہ) غلط کہی تھی، آپ کے خیال

میں وہ مسلمان اس سے متفق ہو جائے گا؟ ایک عالم تو دلیل کے ساتھ بات کر لے گا، لیکن ایک عام آدمی بھی اس بات سے متفق نہیں ہو گا، چاہے اس کے پاس دلیل ہو یا نہ ہو۔ مغرب اسے کٹھنٹ کا نام دیتا ہے، جبکہ ہم اسے عقیدہ کہتے ہیں۔ ہماری آج کی اس پوزیشن نے مغرب کو پاگل کر رکھا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مسلمان قرآن کریم کی یا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے حرمتی برداشت نہیں کرتا۔

ایک مغربی دانش وریہ بھی کہتا ہے کہ یہ مسلمان عجیب لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں مغرب میں آ کر رہتے ہیں، شراب پیتے ہیں، حرام کاریاں کرتے ہیں، سب کچھ کرتے ہیں، لیکن جو نہیں ان میں سے کسی کے سامنے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام لیں تو وہ بالکل بدل جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم میں اور مسلمانوں میں ایک فرق یہ ہے کہ ہمیں ایسی کسی بات پر غصہ نہیں آتا۔ ہمارے سامنے کوئی Jesus (عیسیٰ علیہ السلام) کی توہین کرے تو کوئی غصہ نہیں کرتے، بلکہ بعض اوقات ہم اسے انجوائے کرتے ہیں۔ ایک مسلمان کو ایسی ہربات پر غصہ آ جاتا ہے۔ یہ جذباتی قوم ہے۔

## آسمانی تعلیمات سے انحراف

میں نے بھی ان مغربی دانش ورلوں کے جواب میں دو چار باتیں لکھیں جو میں یہاں دھرا دیتا ہوں۔ اس نے کہا کہ مسلمانوں کو ایسی باتوں پر غصہ آتا ہے جبکہ ہم یہ سوچ کر کہ یہ اس بندے کا آزادی رائے کا حق ہے، اس بات کو انجوائے کرتے ہیں کہ کوئی بائبل کی غلطی نکالے، Jesus (عیسیٰ علیہ السلام) کی توہین کرے۔ میں نے اسے کہا کہ بھتی زندہ کنکشن اور مردہ کنکشن میں یہی فرق ہوتا ہے۔ سکنل اگر موجود ہیں تو فون سیٹ کچھ نہ کچھ تو کام کرنے گا اور اگر سکنل ہی موجود نہ ہوں، کنکشن ہی ڈیڈ ہو تو وہاں جدید ترین فون سیٹ بھی کیا کام کرے گا؟ وہ سیٹ پھر اپنے آپ ہی انجوائے کرے گا، اور تو وہ کسی کام کا نہیں۔ ہم مسلمانوں کی خرابیاں فون سیٹ کی خرابیاں ہیں، کنکشن ہمارا آج بھی قائم ہے۔ قرآن کے ساتھ بھی قائم ہے اور رسول کے ساتھ بھی قائم ہے۔ اس کنکشن کی لمبی قیامت تک ہے۔ اس کا بیان ختم نہیں ہوتا۔ ہماری خرابیاں فون سیٹ میں ہیں۔ اللہ کرے، ہمارے سیٹ نہیک ہو جائیں۔ جبکہ تمہارا تو سوچ ہی آف ہے، تم نے کیا

غصہ کرنا ہے؟

ایک مغربی دانش ورنے کہا کہ ہم نے خدا، رسول گما جوالہ چھوڑ دیا۔ مسلمانوں نے ابھی تک خدا، رسول کا حوالہ ذہن پر مسلط کر رکھا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ بات سنو، ہم پر کس بات کا رعب جماتے ہو کہ ہم نے حوالہ چھوڑ دیا۔ تمہارے پاس تھے یہ جو تم نے چھوڑا ہے؟ تورات اپنی اصل اور خالص شکل میں دنیا میں کہیں ہے؟ انجلیل کہیں دنیا میں ہے؟ زبور کہیں ہے؟ ہمارے پاس تو قرآن ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت موجود ہے۔ یہ تہذیب انبیاء دی فرق ہے۔ دنیا کا کوئی یہودی تورات کے کسی نفحے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہے کہ یہ وہ تورات ہے جو موئی علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، دنیا کا کوئی یہودی یہ حوصلہ نہیں کرے گا۔ میں جذبات کی بات نہیں کر رہا، حقائق کی بات کر رہا ہوں۔ دنیا کا کوئی عیسائی انجلیل کے کسی نفحے پر ہاتھ رکھ کر یہ بتے نہیں کر سکتا کہ یہ وہ انجلیل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ لیکن دنیا کا ہے مسمان دنیا کے کسی بھی حصے میں، قرآن کریم کے کسی بھی نفحے پر ہاتھ رکھ کر بڑے حوصلے سے یہ بات کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی قرآن ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

آج سے کوئی بارہ چودہ سال پہلے کی بات ہے، کیلی فورنیا یونیورسٹی میں بابل پر پندرہ دن مسلل ایک سینما نار ہوا۔ دنیا سے بابل کے چوتھی کے ایک سو ماہرین جمع ہوئے اور پندرہ دن یہ طے کرنے کے لیے بیٹھے رہے کہ انا جیل اربعہ میں عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کتنی ہیں۔ بابل کے دو حصے ہیں: عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید (Old Testament & New Testament)۔ عہد نامہ قدیم میں تورات، زبور اور ان سے متعلقہ رسائل ہیں جبکہ عہد نامہ جدید میں انا جیل اور ان سے متعلقہ رسائل ہیں۔ یہ ماہرین یہ طے کرنے بیٹھے کہ ان انا جیل میں الحاقی تعلیمات کتنی ہیں اور اصل کتنی ہیں۔ پندرہ دن کے غور و خوض کے بعد انہوں نے جو فیصلہ دیا، وہ دنیا کے بڑے میگزینز میں چھپا اور باقاعدہ ریکارڈ پر ہے۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ انا جیل میں پندرہ فیصد آیات ایسی ہیں جن کے بارے میں ملن غالب کے درجے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات ہیں، باقی سب الحاقی ہیں۔ یہ فیصلہ میرا نہیں ہے۔ امریکہ کی

ریاست کیلی فورنیا میں دنیا بھر سے اکٹھے ہونے والے بائبل کے ایک سو ماہرین کا یہ فیصلہ ہے۔ دوسرا حوالہ پاکستان کا ہے۔ ہمارے شہر گوجرانوالہ میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ وہاں سے ان کا ایک اردو ماہنامہ رسالہ نکلتا ہے ”کلام حق“۔ یہ رسالہ تقریباً بیس سال سے میری نظر میں ہے۔ گزشتہ سال ”کلام حق“ نے ایک مضمون چھاپا جس میں اس بات کی نشان دہی کی گئی کہ لاہور سے چھپنے والی انگلش بائبل میں اکتا لیس آیات بدل دی گئی ہیں۔ مضمون نگارنے باقاعدہ حوالے دیے کہ پچھلے ایڈیشن میں یہ آیت یوں تھی اور اس نئے ایڈیشن میں یہ آیت یوں ہے۔ پچھلے ایڈیشن میں یہ جملہ نہیں تھا، جبکہ اس نئے چھپنے والے ایڈیشن میں یہ نیا جملہ موجود ہے۔ پچھلے ایڈیشن میں فلاں جملہ تھا، لیکن نئے ایڈیشن سے غائب ہے۔ اس نے باقاعدہ یہ موازنہ کر کے بتایا۔ میں نے اس پر لکھا کہ بھئی، ایک ایڈیشن میں اس کتاب کی اکتا لیس آیات بدلی گئی ہیں تو دو ہزار سال میں اس کتاب کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا؟ کیونکہ اس کتاب کی عمر تو دو ہزار سال ہے۔ لیکن ہمارے پاس تو قرآن اور بیجنل ہے۔ یہ صرف ہمارا دعویٰ ہی نہیں بلکہ دنیا مانتی ہے کہ یہ اور بیجنل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن صحابہ کرامؐ کو دیا جنہوں نے اسے مرتب کر لیا۔ درمیان میں کوئی تیراواسط نہیں تھا۔ قرآن کے وہ چھ سات نسخے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، ان میں سے دو یا تین اصلی نسخے اس وقت بھی موجود ہیں۔ مصاہف عثمانی چھ یا سات تھے۔ ایک ترکی کے توپ کا پی میوزیم میں ہے، ایک تاشقند کی مرکزی جامع مسجد کے میوزیم میں ہے اور ایک لندن میں اٹھایا آفس لامریکی میں ہے۔ لندن والا نسخہ تو میں نے بھی دیکھا ہوا ہے۔ یہ نسخے مختلف بادشاہوں کے پاس رہا۔ صفوی بادشاہوں کے پاس، سلطان سلیم آف ترکی کے پاس رہا، جہانگیر بادشاہ اور شاہ جہان کے پاس رہا۔ کوئی چھ یا سات بادشاہوں کی مہریں اس پر گلی ہوئی ہیں اور اس کے آخر میں لکھا ہے: کتبہ عثمان ابن عفان۔ اللہ کی تکوئی حکمت دیکھیں کہ یہ نسخہ کہاں پڑا ہوا ہے؟ لندن میں۔

## بیمن میں مصحف علوی کا انکشاف

ایک دلچسپ قصہ آپ کو بتاؤں۔ حضرت مولانا منتظر احمد چنیویؒ آپ نے دیکھے ہوں گے۔

ہم نے تو خیر زندگی کا ایک حصہ اکٹھے گزارا ہے، اکٹھے کام کیا ہے۔ ۱۹۸۸ء کے دوران قوی اخبارات میں ایک خبر چھپی کہ یمن میں قرآن کریم کا ایک پرانا نسخہ برآمد ہوا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت علیؑ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ میں اس زمانے میں ترجمان اسلام کا ایڈیٹر ہوتا تھا۔ مولانا دفتر میں آئے اور کہا کہ یاد یہ خبر پڑھی ہے؟ میں نے کہا، جی پڑھی ہے۔ تو اپنے ہی لجھے میں کہتے ہیں کہ ”کدھا میں کوئی شرارت نا ہو دے“۔ کہیں یہ کوئی شرارت نہ ہو کہ قرآن کا نسخہ وہ نہ ہو جو چودہ سو سال سے چلا آ رہا ہے اور یہ کہہ دیا جائے کہ حضرت علیؑ کا قرآن تو کوئی اور تھا۔ اور یہ جھگڑا تو ویسے بھی چل رہا ہے۔ مولانا کے ذوق کی داد دیجیے، اللہ ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے۔ کہنے لگے کہ ”مز میں ویناں“، میں بس جاتا ہوں دیکھنے کے لیے۔ اس کام کے لیے مولانا نے جیب سے خرچہ کیا، مکن گئے، صنعتیں قرآن کریم کا وہ نسخہ دیکھا اور تحقیق کی۔ مولانا تو شیعہ سنی موضوع کے بہت بڑے مناظر تھے۔ شیعہ سنی جھگڑے کے سارے نکات جن پر جھگڑے تھے، ان پر قرآنی آیات خاص طور پر دیکھیں۔ ایک ہفتہ کے بعد وطن واپس تشریف لائے اور بتایا کہ میں نے ساری جگہیں دیکھی ہیں، مصحف عثمانی اور مصحف علیؑ میں کوئی فرق نہیں ہے اور جرمن ماہرین نے ایک سال اس قرآن کریم کو اپنے پاس رکھ کر اس پر تحقیق کی ہے اور پھر اس پر رپورٹ دی ہے کہ یہ کاغذ بھی حضرت علیؑ کے زمانے کا ہے اور یہاں بھی اسی دور کی ہے اور خط بھی حضرت علیؑ کا ہی ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک مجزہ ہے۔

### ایرانی مجتہد سے مولانا چنیوٹی کا مکالمہ

ایک واقعہ اور بتا دیتا ہوں۔ ۱۹۸۷ء میں سنی علاما کا ایک وفد ایران گیا تا کہ انقلاب ایران کے اثرات دیکھ سکے۔ اس وفد میں مولانا منظور احمد چنیوٹی تھے، حافظ حسین احمد بھی تھے، میں بھی تھا، اور بہت سے علماء تھے۔ باقی تفصیلات تو چھوڑ دیے، بس نکتے کی بات بتاتا ہوں۔ اس زمانے میں علامہ احسان الہی ظہیر مرحوم کی کتاب ”الشیعۃ والقرآن“، منظر عام پر آئی تھی۔ اس کتاب نے دنیا میں بڑا طوفان پا کیا تھا کہ شیعوں کا موجودہ قرآن کریم پر ایمان نہیں ہے۔ اس موضوع پر عربی زبان میں یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ اس زمانے میں ایران عراق جنگ تھی۔ عراق نے تولاکھوں کی تعداد میں

یہ کتاب تقسیم کرائی اور علامہ احسان الہی ظہیر مرحوم شاید اسی کتاب کی وجہ سے دہشت گردی کا شکار ہوئے۔ خیر، ایران کے سینٹ ہال میں ہماری ایک نشست ہوئی۔ اس میں آیت اللہ خزنعلی تھے۔ آیت اللہ صاحب نے وہاں ایک بچے سے قرآن کریم پڑھوایا اور اس بچے نے اچھا قرآن پڑھا۔ پھر آیت اللہ صاحب نے تقریر کی کہ ہمارے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہم قرآن کریم پر ایمان نہیں رکھتے۔ ”واللہ، ما ایمان داریم“۔ پھر قرآن انہوں نے جیب سے نکالا اور کہا کہ ”ایں قرآن حق است، یک حرف کم نہ زیاد“۔ کہ خدا کی قسم! ہمارا اس قرآن پر ایمان ہے، اس کا نہ ایک حرف کم ہے نہ زیادہ اور یہ کہ لوگ خواہ مخواہ ہمارے بارے میں پر اپنیگندہ اکرتے رہتے ہیں۔

آیت اللہ خزنعلی ان کی پانچ بڑی آیتوں میں سے ہیں۔ مولانا چنیوٹی اور میں اس نشست میں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑی مجلس لگی ہوئی تھی۔ مولانا مجھ سے کہتے ہیں: ”مڑچھیڑاں اینوں میں؟“ میں اسے ذرا چھیڑوں؟ بس پھر مولانا کھڑے ہو گئے۔ مولانا تو مناظر آدمی تھے۔ کہا کہ جی، آپ نے یہ بات کی کہ قرآن کریم پر آپ کا ایمان ہے۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ ہم تو پہلی دفعہ آپ سے یہ بات سن رہے ہیں کہ نہ یک حرف کم نہ زیاد، لیکن ہمارا ایک اشکال ہے۔ اگر آپ اسے حل فرماسکیں۔ آیت اللہ صاحب فارسی میں بات کر رہے تھے جبکہ مولانا صاحب عربی میں۔ آیت اللہ صاحب نے کہا کہ جی فرمائیں۔ مولانا صاحب نے کہا کہ آپ کے ہاں صحابہ اربعہ میں روایات ہیں کہ یہ قرآن محرف ہے، اصل نہیں ہے۔ اصل قرآن امام غائب کے پاس ہے۔ اگر آپ کے کہنے کے مطابق یہ قرآن بالکل اصل ہے، نہ یک حرف کم نہ زیاد، تو پھر ان روایات کا کیا ہوگا؟ وہ بھی عالم آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کے ہاں بھی امام سیوطی نے لکھا ہے کہ پہلے قرآن کی سترہ ہزار آیات تھیں، لیکن بعد میں چھ ہزار رہ گئیں۔ آپ قرآن کے بارے میں اپنی اس روایت کو نہیں مانتے اور ہم اپنی ان روایات کو نہیں مانتے۔

مولانا پھر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ نہیں جی، اتنا آسان نہیں ہے۔ سیوطی ہمارے ہاں پانچوں چھٹے درجے کے آدمی ہیں۔ ہم نہ بھی مانیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن آپ کے ہاں کی روایات تو صحابہ اربعہ کی روایات ہیں۔ جیسے ہماری صحابہ ستہ ہیں، اسی طرح شیعوں کی صحابہ اربعہ ہیں۔

مولانا نے کہا کہ یہ صحاح اربعہ کی روایات ہیں اور کچھ کم نہیں، بلکہ دو ہزار روایات ہیں۔ ہمارے ہاں تصورت حال یہ ہے کہ ہم سیوطی کونہ بھی مانیں تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کی روایات تو امام جعفر صادقؑ سے ہیں۔ آیت اللہ صاحب نے پھر کہا کہ امام جعفر صادقؑ ہی کا قول ہے کہ جو روایت قرآن کے خلاف ہو، اسے دیوار پر دے مارو۔ لبکہ ہم ان روایات کو دیوار پر مارتے ہیں۔ مولانا پھر کھڑے ہو گئے کہ ہمیں بہت خوشی ہو رہی ہے کہ آپ قرآن کریم کے حوالے سے ایسی بات کر رہے ہیں۔ لبکہ ایک بات اور ہے۔ اگر اسے آپ واضح کر دیں تو ہمارا ذہن صاف ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں مسلمات میں ہے کہ جو آدمی قرآن کریم کی تحریف کا قائل ہے، وہ مسلمان نہیں ہے۔ آپ کے ہاں ایسے آدمی کی کیا حدیث ہے؟ کیا آپ ایسے آدمی کو مسلمان سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کی تحریف کا قائل ہو؟ آیت اللہ صاحب مسکراۓ اور کہنے لگے کہ جی چائے مٹھنڈی ہو رہی ہے۔ آپ چائے پیں، مجھے کہیں جانا ہے۔

خیر، بات نکلی تھی بعض مغربی دانشوروں کی اس بات سے کہ ہم نے تو خدا، رسول اور بابل کا حوالہ چھوڑ دیا، جبکہ مسلمانوں نے ابھی تک خدا، رسول اور قرآن کا حوالہ نہیں چھوڑا۔ اس پر میں نے ان سے کہا تھا کہ بھئی، تمہارے پاس تھا کیا جو تم نے چھوڑا ہے؟ جبکہ ہمارے پاس تو موجود ہے۔ قرآن کریم بھی اور بینل ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ بھی ہمارے پاس اور بینل ہے۔ دین دوہی باتوں کا نام ہوتا ہے، آسمان سے اترنے والی وحی اور جس نبی پر وحی اتر رہی ہے، اس کی تشریحات۔ ہماری اصطلاح میں اسے قرآن و سنت کہتے ہیں۔ قرآن بھی اصل ہے اور اس پر پیغمبر کا عمل، تشریح، ارشادات بھی اصلی حالات میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم سے جو موقع کرتا ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں گے، وہ بہت بے وقوف ہے۔ اس پر میں نے ایک لطیفہ لکھا کہ دو دوست آپس میں بینٹھ کر بات کر رہے تھے۔ ایک دوست نے دوسرے سے پوچھا کہ اللہ تمہیں دو مکان دے دے تو کیا کرو گے؟ اس نے کہا کہ ایک تمہیں دے دوں گا۔ اس نے کہا کہ اگر اللہ تمہیں دو موڑ سائیکل دے دے تو کیا کرو گے؟ دوسرے نے کہا کہ ایک تمہیں دے دوں گا۔ پہلے نے پھر کہا کہ اگر اللہ تمہیں دو بھینیں دے دے تو کیا کرو گے؟ دوسرا کہنے لگا، وہ

میرے پاس پہلے سے موجود ہیں، تم ان پر نظر مت رکھو۔

تو ہمارے پاس دونوں چیزوں اور بینل ہیں۔ آپ حضرات تصور نہیں کر سکتے کہ ان دونوں چیزوں کے موجود ہونے سے مغرب کتنا پریشان ہے۔

### دین کی حفاظت میں مدارس کا کردار

آج کل مدارس کے بارے میں کئی سطح پر کئی طرح کے اقدامات ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال واشنگٹن میں ایک دوست کے ساتھ ایک مکالے میں، میں نے یہ کہا کہ مغرب کو مدارس کے بارے میں ایک مغالطہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن و سنت مدارس کی وجہ سے محفوظ ہیں اور یہ کہ مدارس نہیں ہوں گے تو قرآن کریم کی تعلیم بھی نہیں ہوگی۔ اس لیے یہ مدارس کو ختم کرنا چاہ رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب مدارس نہیں رہیں گے تو قرآن و سنت کی تعلیم نہیں رہے گی، جب تعلیم نہیں رہے گی تو کمٹنٹ باقی نہیں رہے گی، جب کمٹنٹ باقی نہیں رہے گی تو ہم جو چاہیں گے کر لیں گے۔ میں نے کہا کہ ان کا یہ مغالطہ ہے۔ میں نے کہا، قرآن و سنت اس لیے موجود نہیں ہیں کہ مدارس موجود ہیں، بلکہ مدارس اس لیے موجود ہیں کہ قرآن و سنت موجود ہیں۔ قرآن و سنت کی وجہ سے مدارس موجود ہیں۔ قرآن نے تو قیامت تک رہنا ہے۔ جو اس سے وابستہ ہوگا، وہ بھی رہتے گا۔ ہمارا قرآن پر کوئی احسان نہیں ہے۔ ہم اس کی حفاظت نہیں کر رہے، بلکہ قرآن ہماری حفاظت کر رہا ہے۔ اگر ہمارے اندر بھی کسی کے ذہن میں یہ مغالطہ ہے تو دور کر لے کہ ہم قرآن کی حفاظت نہیں کر رہے بلکہ ہماری قرآن سے وابستگی میں ہماری حفاظت ہے۔ اللہ نے تو یہ حفاظت ہمارے ذمے لگائی ہی نہیں ہے۔ پہلی امتوں کے ذمے ان کی کتابوں کی حفاظت لگائی گئی تھی: *بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ۔ (المائدہ: ۵۲۲)* ہمارے بارے میں تو اللہ نے صاف کہہ دیا کہ *إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الْجُرْجَ: ۹۱)*۔

### قرآن و سنت کی تعبیر نو کا مسئلہ

ضمناً ایک بات ذہن میں آگئی کہ آج کل اس بات پر بھی زور دیا جا رہا ہے کہ قرآن اگر ختم

نہیں ہوتا تو قرآنی تعلیمات ختم کر دو۔ اصل مسئلہ تو کمپنٹ کا ہے کہ مسلمان کوئی دوسری بات سنتا ہی نہیں اور اس کے پیچھے وجہ قرآن و سنت کی موجودگی ہے۔ قرآن و سنت کی موجودگی کی وجہ مدارس ہیں اور مدارس کی موجودگی کی وجہ ہیں مولوی۔ تو قرآن کریم اگر تبدیل نہیں ہوتا تو کم از کم اس کی شرح تو تبدیل ہو جائے۔ قرآن و سنت کی تعبیر نہ ہو جائے۔ گزشتہ ڈیڑھ دوسو سال سے ہمارے دانش و رسم کھپار ہے ہیں۔ کبھی ایک حلقة کھڑا ہوتا ہے، کبھی دوسرا حلقة کھڑا ہوتا ہے کہ تعبیر نہ کرو۔

ایک ایسے ہی دانشور سے میری گفتگو ہوئی۔ میں نے پوچھایا، تم لوگ کس مصیبت میں پڑے ہوئے ہو؟ تمہارے خیال میں قرآن و سنت نئی تعبیر کو لوگ مان لیں گے؟ میں نے پوچھا کہ قرآن و سنت کس زبان میں ہیں؟ کہا، عربی میں۔ میں نے پوچھا، عربی زبان زندہ زبان ہے یا مردہ زبان؟ بابل کا مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ مردہ زبان، عبرانی میں تھی۔ قرآن عربی زبان میں ہے اور عربی زبان زندہ زبان ہے۔ عربی کی لغت، محاورے، ضرب المثل، تشریحات سب موجود ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی تشرع میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت دونوں موجود ہیں۔ یعنی قرآن کریم کی فلاں آیت کی تشرع حضورؐ نے اس طرح کی ہے، کیا یہ ریکارڈ پر ہے یا نہیں؟ رسول اللہؐ نے فلاں آیت پر یوں عمل کیا، یہ بھی ریکارڈ پر ہے یا نہیں؟ اگر کوئی عام مسلمان یہ معلوم کرنا چاہے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت کا ترجمہ کے اعتبار سے مفہوم کیا ہے اور نبی کریمؐ نے اس آیت کی تشرع کیسے کی ہے، کیا عام مسلمان کی اس بات تک رسائی ممکن ہے یا نہیں؟ پھر یہ کہ دنیا کا کوئی مسلمان قرآن کریم کی آیت سمجھنے کے لیے عربی زبان تک رسائی حاصل کرنا چاہے اور اس کی تشرع میں حضورؐ کی تعلیمات تک رسائی حاصل کرنا چاہے، کیا یہ ممکن ہے یا نہیں؟ تو میں نے کہا کہ ان دو باتوں کے ہوتے ہوئے کوئی دانشور یہ سورج بھی کیسے سکتا ہے کہ اس کی اختراع کی ہوئی تشرع قبول کر لی جائے گی۔ ایک آیت کے متعلق ایک مسلمان کو پہتے چل جائے کہ حضورؐ نے اس پر یوں عمل کیا ہے تو دنیا کی کوئی دلیل، کوئی تشرع، کوئی قوت اس مسلمان کو کسی نئی تشرع پر آمادہ نہیں کر سکے گی۔ تو میں نے کہا کہ بھی کیوں اپنا وقت اور پیسہ ضائع کر رہے ہو؟ ایک حلقة کھڑا کرتے ہو۔ دس پندرہ سال ایک شور و غل مچتا ہے، بعد میں وہ ٹھس ہو جاتا ہے۔ میں نے

کہا کہ کئی حلقات تو میرے سامنے بٹھس ہوئے ہیں۔

بات چلی تھی فلینگ روز کے کارڈنالوں سے۔ بات چونکہ بہت زیادہ اہم تھی، اس لیے میں نے بھی اسے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مغربی دانش وردوں نے کہا کہ مسلمانوں نے قرآن و سنت کا حوالہ باقی رکھا ہوا ہے جبکہ ہم نے رسول اور بابل کا حوالہ چھوڑ دیا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ تمہارے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں جسے چھوڑنے کا تم احسان جتار ہے ہو۔ ہمارے پاس تو الحمد للہ قرآن بھی اپنی اصل حالت میں ہے اور اس کی تشرع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حدیث عمل بھی اصلی حالت میں موجود ہے۔ اس لیے ہم سے کوئی یہ توقع نہ کرے کہ ہم اسے چھوڑ دیں گے۔ اگر کوئی یہ توقع کرتا ہے تو اس سے بڑا کوئی بے وقوف دنیا میں نہیں ہے۔

حقوق کے فلسفے میں مغرب اور ہمارے درمیان ایک فرق تو میں نے یہ عرض کیا تھا کہ مغرب صرف سوسائٹی کی بات کرتا ہے، انسانوں کے حقوق کی بات کرتا ہے، جبکہ ہم بات کرتے ہیں حقوق اللہ کی اور حقوق العباد دونوں کی۔ دوسرا فرق میں نے یہ بتایا تھا کہ مغرب جب حقوق کی بات کرتا ہے تو اس کی بنیاد اس بات پر ہوتی ہے کہ سوسائٹی کیا چاہتی ہے اور سوسائٹی کیا سوچتی ہے، جبکہ ہمارے ہاں حقوق کی بنیاد علومِ وحی پر ہے۔ ہمارا تصور یہ ہے کہ فَاحْكُم بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ۔

تیسرا اہم فرق یہ ہے کہ مغرب جب حقوق کی بات کرتا ہے تو وہ فرد سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ تمہارا حق ہے۔ مغرب حقوق مانگنے کا سبق دیتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام حقوق دینے کی بات کرتا ہے۔ اسلام فرد سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ تمہارے ذمے یہ حق ہے۔ اس بات پر ذرا غور کیجیے۔ مغرب حقوق حاصل کرنے کی بات کرتا ہے، جبکہ اسلام حقوق ادا کرنے کی بات کرتا ہے۔ دنیا کا ہر شخص اگر حق مانگنے پر آ جائے تو تصور کیجیے کہ سوسائٹی کا کیا حال ہو گا؟ اس کے برعکس دنیا کا ہر شخص حق ادا کرنے پر آ جائے تو سوسائٹی کی کیا صورت ہو گی؟ تو ہم مغرب سے کہتے ہیں کہ تم حق وصول کرنے کی بات کرتے ہو جبکہ ہم حق ادا کرنے کی بات کرتے ہیں۔ یہ تیسرا لیکن بہت اہم فرق ہے۔

## مغرب میں انسانی حقوق کا تاریخی پس منظر

اب میں مغرب کے حقوق کے فلسفے کی وضاحت کرتا ہوں، لیکن اس کے لیے اس کی کچھ تاریخ سمجھنا بھی ضروری ہے۔ اقوام متعددہ کا انسانی حقوق کا چارٹر تو اس کا آخری مرحلہ ہے، لیکن اس سے پہلے ایک پوری تاریخ ہے جس سے گزر کر مغرب کے ہاں حقوق کا فلسفہ یہاں تک پہنچا ہے۔ مغرب جو یہ کہتا ہے کہ ہم نے انسانیت کو حقوق سے متعارف کرایا، انسانوں میں حقوق کا شعور پیدا کیا، میں اس کی تھوڑی سی تاریخ آپ کے سامنے بیان کرنا چاہوں گا۔

برطانیہ انسانی حقوق کا چمپین ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں برطانیہ کا ایک بادشاہ تھا کا نزیڈ دوم۔ کہتے ہیں کہ پارلیمنٹ کا تصور اس نے دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں مطلق العنان بادشاہت کی بجائے ایک پارلیمنٹ اپنے اختیارات کے ساتھ گیارہویں صدی عیسوی میں متعارف ہوئی۔ پہلے اس وقت کے حکومتی نظام کا ڈھانچہ سمجھ لیں۔ تین طاقتیں حکمران تھیں: بادشاہ، جاگیردار اور پوپ۔

عیساویوں کے تین بڑے فرقے ہیں: کیتھولک، پروٹسٹنٹ، آرٹھوذکس۔ کیتھولک فرقے کے سربراہ کو پاپائے روم کہتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ کے سربراہ آرچ بشپ آف کینٹربری (Archbishop Of Canterbury) ہیں اور یہ برطانیہ میں ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ صرف کیتھولک فرقہ ہی ہوتا تھا، پروٹسٹنٹ فرقہ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ امریکہ والے زیادہ کیتھولک ہیں، مغربی یورپ والے زیادہ تر پروٹسٹنٹ ہیں، جبکہ مشرقی یورپ اور روس والے زیادہ

آر تھوڑے کس ہیں۔ آر تھوڑے کس بہت زیادہ متشدد ہیں۔

پوپ ایک زمانے میں بہت بڑی قوت تھی۔ پوپ کو باہل کی تشریع کا حق حاصل تھا اور آج بھی ہے۔ پوپ باہل کی جو چاہے تشریع کرے، کسی چیز کو حلال قرار دے دے یا کسی چیز کو حرام قرار دے دے، یہ اس کا اختیار ہے۔ اس کی ایک پاپائے روم کو نسل ہے۔ کوں فیصلے کرتی ہے جبکہ پوپ اسے نافذ کرتا ہے۔ پوپ بذات خود ایک اتحارٹی ہے۔ پوپ کو یہ فائٹل اتحارٹی حاصل ہے کہ وہ باہل کی تشریع میں کچھ بھی کہہ دے۔ یہی مغالطہ آج ہمارے بعض دوستوں کو بھی پریشان کر رہا ہے۔ آج علماء سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اجتہاد سے کام لیں اور اجتہاد سے کام لے کر یہ مسئلہ بدل دیں، وہ مسئلہ بدل دیں۔ لوگوں کے نزدیک اسلام میں اجتہاد کا اختیار ایسا ہی ہے جیسا کہ عیسائیت میں پوپ کے پاس باہل کی تشریع کا اختیار ہے۔ میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ بھئی تم لوگ مغالطے میں ہو۔ عیسائیت میں پوپ کو یہ اتحارٹی حاصل ہے کہ وہ باہل کی کوئی بھی تشریع کر سکتا ہے۔ اسلام میں یہ اتحارٹی کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ یہ بات ذرا سمجھنے کی ہے۔ ہمارے ہاں یہ اتحارٹی کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ قرآن کی تشریع کی بنیاد پر کوئی بھی فیصلہ از خود کر سکے۔

اجتہاد کی بات چل نکلی ہے تو اس حوالے سے ایک لطیفہ میرے ذہن میں آیا ہے۔ ایک دفعہ میں برطانیہ میں سفر کر رہا تھا، لندن سے ماچسٹر کی ٹرین میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک نوجوان مجھے دیکھ کر قریب آ کر بیٹھ گیا اور پوچھا، آپ مولانا صاحب ہیں؟ میں نے کہا، لوگ یہی کہتے ہیں۔ کہنے لگا، آپ کو اجتہاد کا اختیار حاصل ہے؟ میں نے پوچھا، آپ کو کیا مسئلہ درپیش ہے جس میں آپ کو اجتہاد کی ضرورت پڑ گئی؟ اس کے نزدیک اجتہاد کا تصور یہ تھا کہ اجتہاد کسی ایسی اتحارٹی کا نام ہے کہ اگر کسی کے پاس یہ اتحارٹی ہو تو اسے شرعی معاملات میں کوئی بھی فیصلہ دینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور اتنے عرصے سے برطانیہ میں رہ رہا ہوں۔ میں باقاعدہ نماز پڑھتا ہوں، لیکن ظہر اور عصر میری رہ جاتی ہے، کیونکہ دفتر سے نماز کے لیے الگ چھٹی نہیں ملتی۔ چنانچہ میں ایسا کرتا ہوں کہ ظہر تو فجر کے ساتھ پڑھ لیتا ہوں جبکہ عصر میں مغرب کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ اگر آپ کو اجتہاد کا اختیار ہے تو آپ مجھے اس کی اجازت دے دیں۔ میں یہ

بٹانا چاہ رہا ہوں کہ اجتہاد کا عام مفہوم لوگوں کے ذہن میں کچھ اس طرح سے ہے۔ میں نے اس نوجوان سے کہا کہ میں فضیل فضیل کر سکتا ہوں۔ عصر کی نماز جو تم مغرب کے ساتھ پڑھتے ہو، اس کی گنجائش دے سکتا ہوں کہ مجبوری ہے۔ نماز قضا ہو جائے گی، لیکن ہو جائے گی۔ البتہ ظہر کی نماز تم لیچ بریک کے ساتھ پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر بہت زیادہ مجبوری ہے کہ ظہر کی نماز تم لیچ بریک میں بھی نہیں پڑھ سکتے تو پھر ظہر بھی تم مغرب کے ساتھ ہی پڑھ لیا کرو۔ میں نے سوچا کہ یہ تو غنیمت ہے کہ ایک نوجوان اتنے عرصے سے برطانیہ میں ہے اور وہ باقاعدہ نماز پڑھتا ہے۔

بہر حال عیسائیت میں پوپ کو یہ اتحاری حاصل ہے کہ وہ بابل کی کوئی بھی تشریع کر دے اور اپنی مرضی سے کوئی بھی فیصلہ سنادے۔ اس بات پر میں ایک حوالہ دوں گا۔ قرآن کریم کی جب یہ آیت اتری کہ:

اَتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اُرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيَّحَ ابْنَ مَرْيَمَ  
(التوبہ: ۹)

”انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے علاوہ رب بنالیا اور مسیح بن مریم کو بھی۔“

اس پر عدیؑ ابن حاتم نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سوال کیا۔ بخاری کی روایت ہے۔ عدی حاتم طائی کے بیٹے تھے اور عیسائی تھے۔ حاتم طائی نے حضورؐ کا زمانہ نہیں پایا، لیکن وہ اہل حق میں سے تھے۔ حضورؐ سے پہلے جو لوگ حق کا مذہب قبول کرتے تھے تو عیسائیت کا مذہب قبول کرتے تھے۔ کان تنصر۔ حاتم طائی عیسائی ہو گئے تھے اور بت پرستی چھوڑ دی تھی۔

سارا خاندان عیسائی ہو گیا تھا۔ عدیؑ ابن حاتم جب مسلمان ہوئے تو عیسائی سے مسلمان ہوئے۔

عدیؑ ابن حاتم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ قرآن کریم نے ہمارے بارے میں کہا ہے کہ اَتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اُرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ، کہ انہوں نے اپنے علماء مشائخ کو رب بنالیا ہے، لیکن ہم تو اپنے احبار و رہبان کو رب نہیں بناتے تھے۔ قرآن کریم نے یہ بات ہمارے بارے میں کیسے کہی ہے؟ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، یہ بتاؤ کہ تمہارے احبار و رہبان کو حلال کو حرام قرار دینے اور حرام کو حلال قرار دینے کی اتحاری حاصل تھی؟

عدیؑ نے کہا، جی یہ اختیار تو حاصل تھا۔ یعنی کسی حلال کو حلال کی فہرست سے نکال کر حرام کی فہرست میں شامل کر دیں یا کسی حرام کو حرام کی فہرست سے نکال کر حلال کی فہرست میں شامل کر دیں، یہ اختیار تو ان کو حاصل تھا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا، اس آیت کا یہی مطلب ہے۔ (ترمذی، رقم ۳۰۹۵)

*(تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورہ توبہ، آیت ۳۱)*

حلال و حرام کا اختیار کس کے پاس ہے؟ اللہ کے پاس۔ اگر یہ اتحارثی اللہ کے سوا کسی کے پاس ہوتی تو پھر کس کے پاس ہوتی؟ انبیا کے پاس۔ اور انبیا میں سب سے بڑے پیغمبر کون ہیں؟ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اللہ تعالیٰ کیسے مخاطب ہوتے ہیں: **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لَمْ تُحَرِّمْ مَا أَحَلَ اللَّهُ لَكَ** (الحریم ۱: ۲۶) اے اللہ کے نبی! ہم نے تو حلال کیا تھا، آپ نے کیسے حرام کر دیا؟ **تَبَتَّعْنِي مَرْضَاتَ أُزُوَاجِكَ**۔ ہم تو اس مکملے کا ترجمہ بھی ڈرتے ہوئے کرتے ہیں۔ **فَدُفَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحْلَةً أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَانِكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ** (الحریم ۲: ۲۶) تو اللہ نے اپنے نبی سے کہا کہ یہ آپ کا اختیار نہیں ہے کہ کسی چیز کو حلال سے حرام کر دیں۔ میں یہ بات واضح کر رہا تھا کہ عیسائیت میں آج بھی پوپ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی چیز کو حلال سے حرام کر سکتا ہے اور حرام سے حلال کر سکتا ہے۔ عدیؑ ابن حاتم کے سوال کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو حلال و حرام کا اختیار دے دیا جائے۔

## اسلام میں حلال و حرام کی اتحارثی

مگر یہاں ایک سوال ہے کہ حلال و حرام کے اختیار میں پوپ کو دخیل مانیں تو وہ ارباباً من دون اللہ ہے۔ اگر کسی پارلیمنٹ کو حلال و حرام کے اختیار میں دخیل مان لیں تو کیا وہ ارباباً من دون اللہ نہیں ہے؟ اور اگر سوسائٹی کو حلال و حرام کے اختیار میں دخیل مان لیں تو یہ کیا ہے؟ ہم یہی کہتے ہیں کہ نہ پوپ کو، نہ پارلیمنٹ کو اور نہ سوسائٹی کو، نہ مولوی کو، کسی کو بھی یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کے حلال کیسے ہوئے کو حرام قرار دے یا حرام کیسے ہوئے کو حلال قرار دے۔ تو میں

اپنے ان دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ بھی، یہ تمہارا مغالطہ ہے کہ پوپ کی طرح کے اختیارات ہمارے پاس بھی ہیں۔ ہمارے پاس ایسے کوئی اختیارات نہیں ہیں۔

ایک بات میں یہاں ضمیر عرض کر دیتا ہوں۔ اسلام میں یہ اختیار کس کو حاصل ہے کہ اس کی بات حقی ہو اور اس کو چلنے کیا جاسکے؟ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ ویکھیں، میں بھی مقلد ہوں اور آپ حضرات بھی مقلد ہیں۔ ہم امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مقلد ہیں۔ ہم ان پر اعتماد کر کے بغیر دلیل کے بھی ان کی بات مان لیتے ہیں اور ہر آدمی ہر مسئلے کی تحقیق کر بھی نہیں سکتا۔ ان کے بارے میں بھی ہم کیا کہتے ہیں؟ مجتهد یخطیع و یصیب۔ اور ان کا جو فتویٰ ہم بغیر دلیل کے مانتے ہیں، وہ بھی یہ کہہ کر مانتے ہیں کہ صواب یتحمل الخطأ۔ اور اگر کسی مجتهد کا کوئی فتویٰ نہیں مانیں گے تو یہ کہہ کر نہیں مانیں گے کہ خطأ یتحمل الصواب لیکن یہ خطأ اور صواب کا مقابل ہو گانہ کہ حق و باطل کا۔ یہ ہماری حدود ہیں اور یہ صرف امام صاحب کے معاملے میں نہیں، بلکہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے معاملے میں بھی یہی اصول ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے خلیفة المسلمين بنے کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ دیا تھا، اس میں ایک جملہ کہا تھا کہ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کتاب و سنت کے مطابق چلوں گا۔ ان استقامت فاعینونی، اگر سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دینا۔ فیان انا زغت فاقیمونی، اگر سیدھا نہ چلوں تو مجھے سیدھا کرو۔ فلا سمع ولا طاعة، اگر کتاب و سنت کے مطابق نہ چلوں تو پھر نہ میری بات سنونہ میری بات مانو۔

کتاب و سنت کے بعد کسی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ اس کی بات حقی ہو۔ ہاں ہمارے ہاں ترجیح چلتی ہے۔ صواب یتحمل الخطأ، خطأ یتحمل الصواب، مجتهد یخطیع و یصیب ..... یہی ہمارے اصول ہیں اور یہی ہمارے ضابطے ہیں۔ تو میں ان سے کہتا ہوں کہ بھی، آپ کو مغالطہ ہے کہ جس طرح عیسائیت میں پوپ کوئی حقی فیصلہ کر دیتا ہے، اسی طرح مولوی بھی حقی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ نہیں، یہ اختیار نہ پارلیمنٹ کے پاس ہے، نہ مجتهد کے پاس، نہ کسی جماعت کے پاس اور نہ سوسائٹی کے پاس، کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

## پاپائیت اور خلافت میں فرق

مغرب کے انسانی حقوق کی تاریخ اور پس منظر بیان کر رہا ہوں۔ مغرب میں آج سے دوسو سال پہلے تک جو صورت حال تھی، وہ صورت حال سامنے رکھنا ضروری ہے۔ تم مقتدر تو تم تھیں: پاپائے روم، بادشاہ اور جاگیر دار۔ عوام کو کوئی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ عام آدمی تو جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اتحاری صرف ان تینوں کے پاس تھی اور ان میں سے سب سے زیادہ اتحاری پوپ کے پاس تھی۔ پوپ خدا کا نمائندہ کہلاتا ہے اور پوپ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مذہبی طور پر جو بھی کہہ دے، وہ خدا کی طرف سے ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں اسلام میں یہ تصور نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمارے ہاں کوئی شخصیت بھی ایسی نہیں ہے کہ جس کی بات چیلنج نہ کی جاسکے۔ دلیل کی بنیاد پر ہر شخص کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمارے ہاں حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ سے بڑے تو کوئی نہیں ہیں۔ ان سے بھی لوگ دلیل کی بنیاد پر اختلاف کرتے تھے اور بہت سے مسائل میں اب بھی کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے بہت سے تفرادات کو آپ نہیں مانتے۔

ایک بات ضمناً ہن میں آئی ہے۔ اسلام پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اسلام شخصی حکومت کا قائل ہے، یعنی اسلام امیر المؤمنین کے نام سے جو حکومت قائم کرتا ہے، وہ شخصی حکومت ہے اور یہ کہ اسلام ایک شخص کو اتحاری بنادیتا ہے۔ یہ ایک مغالطہ ہے۔ اسلام شخصیت کی حکومت قائم نہیں کرتا، بلکہ دلیل اور قانون کی حکومت قائم کرتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا خلیفہ منتخب ہونے کے بعد سب سے پہلے خطبے میں یہ بیان ایک پالیسی بیان ہے کہ اگر میں قرآن و سنت کے مطابق چلوں تو میری اطاعت تم پر واجب ہے اور اگر قرآن و سنت سے ہٹ جاؤں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔ آپ کے خیال میں یہ شخصی حکومت ہے یا قانون کی حکومت ہے؟ حضرت عمرؓ کہرے ہو کر یہ اعلان فرماتے ہیں کہ میں قرآن و سنت کے مطابق چلوں تو میری بات مانو، اگر قرآن و سنت سے ہٹ جاؤں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔ پھر ایک شخص حضرت عمرؓ کے سامنے

کہڑے ہو کر یہ کہتا ہے: لا سمع، ہم آپ کی بات نہیں سنتے، پہلے آپ فلاں معاملے کی وضاحت کریں۔ راستے میں جاتے ہوئے ایک عورت نے حضرت عبُرگور و کا اور دلیل کے ساتھ کہا کہ آپ کا فلاں فیصلہ قرآن کے خلاف ہے اور حضرت عمرؓ نے وہ فیصلہ واپس لیا۔ میں اس وقت ان واقعات کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ آیا یہ شخصی حکومت ہے یا قانون کی؟ اور یہ ہمارے اہل سنت کے ہاں ہے۔

### خلافت اور امامت میں بنیادی فرق

اہل سنت اور اہل تشیع کا بنیادی اختلاف یہی ہے۔ ہمارے ہاں خلافت تو منصوص ہے، لیکن خلیفہ منصوص نہیں ہے۔ خلیفہ کا انتخاب حضورؐ نے امت پر چھوڑا ہے۔ حضورؐ نے راہنمائی ضرور کی اور اشارات بھی دیے، لیکن عملی طور پر خلیفہ کا انتخاب امت پر چھوڑ دیا۔ امامت اور خلافت میں یہی فرق ہے۔ اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کا انتخاب امت کی صواب دید ہے۔

اہل سنت کی خلافت اور اہل تشیع کی امامت میں تین بنیادی فرق ہیں:

پہلا فرق یہ کہ خلافت منصوص نہیں ہے، بلکہ امامت کے اختیار پر ہے، جبکہ امامت منصوص ہے۔ اسی لیے اہل تشیع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصی رسول اللہ مانتے ہیں۔

دوسرافرق یہ ہے کہ خلافت خاندانی یا نسبی نہیں ہے، جبکہ امامت خاندانی ہے۔ یہ ٹینی صاحب اور خامنہ ای صاحب وغیرہم تو امام غائب کے نمائندے ہیں۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ خلیفہ معصوم نہیں ہے اور خلیفہ کی کسی بھی بات سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جاسکتا ہے، جبکہ امام معصوم ہے اور امام کی کسی بھی بات سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ امام جو کہہ دے، وہی قرآن کی مثا ہے اور جو کہہ دے، وہی سنت کا مفہوم ہے۔ امام کے معصوم ہونے کا معنی ہے معصوم عن الخطأ، وہ غلطی سے پاک ہے۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ امام اتحارٹی ہے۔

اس لیے میں مغرب سے کہا کرتا ہوں کہ تم ہمیں جو طعنہ دیتے ہو کہ تم میں پاپائیت ہے، وہ ہم جمہور مسلمانوں میں تو نہیں ہے۔ ہمارے ہاں خلیفہ نہ منصوص ہے، نہ خاندانی ہے، نہ معصوم ہے اور

نہ ہی اختلاف سے مستثنی اتحارثی ہے۔ اگر پاپائیت کا کوئی تصور ہے تو وہ اہل تشیع میں ہے۔ پوپ اور امام تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اب بھی ایران کے دستور میں ولایت فقیہ کے عنوان سے جو شورائے نگہبان ہے، اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ پارلیمنٹ یا صدر کے نصیلے کو بغیر دلیل کے منسوخ کر سکتی ہے۔ شورائے نگہبان میں چھ آیت اللہ ہیں، پانچ قانون دان ہیں اور اس کے سربراہ خامنہ ای صاحب ہیں۔ اس کو نسل کو یہ اتحارثی حاصل ہے کہ جو وہ کہہ دے، وہی دین ہے۔ جو پاپائے روم کی کو نسل کو اختیار حاصل ہے، وہی ایران کے دستور میں ولایت فقیہ کے ادارے کو حاصل ہے۔ یہ صواب دیدی اختیارات ہمارے اہل سنت کے ہاں کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں بات دلیل اور قانون کی بنیاد پر ہوگی۔ قرآن و سنت سے حوالہ دینا پڑے گا، اگر مقابلے میں قوی حوالہ آجائے تو دستبردار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ ہمارے ہاں شخصی نہیں بلکہ قانون کی حکومت ہے۔

### میکنا کارٹا، حقوق کی پہلی دستاویز

خیریہ بات درمیان میں ضمناً آگئی۔ میں بات کر رہا تھا کہ پاپائے روم، بادشاہ اور جاگیردار کی آپس میں اندر رشینڈنگ ہوتی تھی اور عوام الناس کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ یہ تینوں مل کر حکومت کرتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ ان تینوں کے درمیان جھگڑے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ جاگیرداروں کو بادشاہ سے شکایات ہوئیں۔ آپ انسانی حقوق کے حوالے سے اکثر ایک لفظ سنتے ہیں، میکنا کارٹا (Magna Carta)۔ اسے انسانی حقوق کی سب سے پہلی باضابطہ دستاویز کہا جاتا ہے۔ تقدیماً سات سو سال پہلے تیرہویں صدی عیسوی میں ۱۵ ارجنون ۱۲۱۵ء کو حقوق کے حوالے سے ایک باضابطہ معاہدہ ہوتا ہے کہ فلاں کے یہ حقوق ہیں، فلاں کے یہ حقوق ہیں اور پھر یہ ضابطہ باقاعدہ نافذ ہے۔ جس پر آپ مغرب والوں سے انسانی حقوق کے حوالے سے بات کریں گے تو وہ آپ سے کہیں گے کہ ہماری حقوق انسانی کی تاریخ کا آغاز میکنا کارٹا معاہدے سے ہوتا ہے۔ میکنا کارٹا مغرب کے انسانی حقوق کی ابتدا جبکہ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا رجحان راست کی انتہا ہے۔ میکنا کارٹا ۱۲۱۵ء میں منظور ہوا جبکہ یہ چارڑ ۱۹۳۸ء میں منظور ہوا ہے۔ یہ تقریباً سات صد یوں کا عرصہ بنتا ہے اور ان دو واقعات کے درمیان مغرب کی انسانی حقوق کی تاریخ ہے۔

بنیادی طور پر میکنا کارٹا میں عوام کے حقوق نہیں تھے بلکہ اس وقت کے بادشاہ جان (John) اور جاگیرداروں میں جھگڑے کی بنیاد پر یہ معاہدہ طے ہوا جس میں بادشاہ اور جاگیرداروں کے آپس کے حقوق متعین کیے گئے۔ اس میں کوئی ایک آدھ عوام کا حق بھی تھا۔ اصل جھگڑا بادشاہ اور جاگیردار کا تھا۔ یہ معاہدہ بادشاہ اور جاگیرداروں کے باہمی اختیارات اور حقوق طے کرنے کے لیے کیا گیا۔ اسے مغرب والے انسانی حقوق کی سب سے پہلی دستاویز تصور کرتے ہیں۔

### عوام پر پوپ کے مذہبی مظالم

میکنا کارٹا کے تحت بادشاہ اپنے حقوق و اختیارات کا پابند ہو گیا اور جاگیردار اپنے حقوق و اختیارات کے پابند ہو گئے، جبکہ پاپائے روم کو ابھی تک اتحارٹی حاصل تھی کہ وہ جو چاہے کرے۔ پوپ کے اختیارات میں رکاوٹ آئی ہے سائنسی ترقی و اکشافات سے۔ یہ ایک بی اور المناک تاریخ ہے۔ سائنس نے جب اکشافات کیے کہ چاند یوں گردش کرتا ہے اور سورج اس طرح سے خلماں سفر کرتا ہے اور زمین اس طرح سے سورج کے گرد چکر لگاتی ہے تو چرچ والے ان اکشافات کو نہ صرف بائبل کی رو سے رد کرتے رہے بلکہ اسے ارتدا اور ارادے کر سائنس دانوں اور ماہرین کو سزاۓ موت دیتے رہے۔ اس طرح چرچ والوں نے ہزاروں ماہرین مار دیے۔ آسفوڑ یونیورسٹی پہلے چرچ ہوتا تھا۔ وہاں وہ نشانات ابھی تک محفوظ ہیں جہاں پادریوں کی عدالت لگتی تھی، جس میں ایک سائنس دان اپنے دعوے کے ساتھ پیش کیا جاتا کہ چاند گردش کرتا ہے۔ بس پادری فیصلہ سنا دیتے کہ یہ مرتد ہو گیا ہے، اسے قتل کر دو۔ کوئی ماہر کہتا کہ ہوا میں فلاں چیز اس طرح سے کام کرتی ہے، بس اسے خدا کے معاملات میں دخیل سمجھ کر قتل کر دیا جاتا۔ تقریباً دوسو سال تک ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہزار ہا افراد قتل کیے جاتے رہے۔

چنانچہ دو باتوں میں چرچ رکاوٹ بنا، ایک سائنسی ترقی میں اور دوسرے آزادی رائے میں۔ پوپ چونکہ خدا کا نمائندہ تصور ہوتا تھا، اس لیے جو آدمی بھی اس سے اختلاف کرتا، اسے مرتد سمجھ کر قتل کر دیا جاتا اور ایسا اب سے تین سو سال پہلے تک ہوتا رہا ہے۔ ہمارے ہاں تو خلفاء راشدین سے بھی اختلاف رائے کا حق لوگوں کو حاصل تھا اور بہت سے مواقع پر خلفاء راشدین نے لوگوں

کے اختلاف پر اپنے فیصلے واپس بھی لیے۔ اس کے بعد چرچ اور پوپ نے یہ روایہ اختیار کر لیا کہ جو بھی اختلاف کرتا ہے، وہ مرتد ہے۔ سائنسی اکتشافات اور اختلاف رائے پر ہزاروں لوگ آگ میں جلانے گئے، ہزاروں پھانسی پر چڑھائے گئے، ہزاروں لوگ قتل کیے گئے۔ اس صورت حال نے پوپ کے خلاف بغاوت پیدا کی۔ اب نہ تو سائنسی ترقی رکے گی اور لوگ رائے کا حق بھی نہیں چھوڑ سیں گے۔ چنانچہ چرچ اور پوپ کے عمل میں ایک بغاوت اٹھی اور اس بغاوت کے نتیجے میں ایک نیا فرقہ وجود میں آیا جسے پروٹسٹنٹ کہتے ہیں۔ یہ پروٹسٹنٹ فرقہ پوپ کی مطلق العنانی، خدائی اختیارات کے استعمال، باسل کی من مانی تشریع اور مقنود دانہ رویے کے عمل کے طور پر وجود میں آیا۔ پروٹسٹنٹ فرقے کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ ہر آدمی کو باسل سمجھنے کا حق حاصل ہے اور صرف پوپ باسل کا ٹھیکیدار نہیں ہے۔ پروٹسٹنٹ کی تحریک میں بہت سے مفکرین نے کام کیا، لیکن مارٹن لوٹھر (وقات: ۱۵۲۶ء) کا نام زیادہ نمایاں ہے جو جمنی کا ایک پادری تھا اور اس نے اصلاح مذہب کی تحریک (Reformation) کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

## مولوی کی اجارہ داری؟

اس پس منظر میں اب بالکل یہی صورت حال ہمارے ہاں مسلمانوں میں بھی پیدا کی جا رہی ہے کہ ہم قرآن و سنت کی تشریع میں مولوی کی اجارہ داری نہیں مانتے۔ ہم کامن سنسنیس (Common Sense) سے قرآن کی تشریع کریں گے، لیکن یہ بالکل مخالف طے پرمنی ہے۔ مارٹن لوٹھر کی تحریک پوپ کی مطلق العنانی کے خلاف تھی کہ پوپ خدا کا نمائندہ تصور ہوتا تھا اور اسے یہ اتھارٹی حاصل تھی کہ اس کے پاس چاہیے دلیل ہے یا نہیں، وہ جو بات کہہ دے گا وہ حقی ہو گی اور اسے چیلنج نہیں کیا جاسکے گا۔ میں ان دلنش و دروں سے کہتا ہوں کہ مارٹن لوٹھر کی بات ضرور پڑھو، لیکن پس منظر کو بھی تو ٹھیک طرح سے دیکھو۔ کیا ہمارے ہاں قرآن و سنت کی تشریع میں پوپ والی کیفیت ہے؟ ہمارے ہاں تو ہزاروں مسائل میں علمی اختلافات چلے آرہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو دلیل کی بنیاد پر صحابہ کرامؐ کے زمانے سے جو مباحثہ شروع ہوئے ہیں، اب تک چلے آرہے ہیں اور قیامت تک چلتے رہیں گے۔ ہم تو بات ہی اختلاف پر کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو کسی کو یہ

اختیار حاصل ہی نہیں کہ وہ یہ کہے کہ میری بات آخری اور حتمی ہے۔ اس لیے ہماری مذہبی قیادت کو اگر پوپ پر قیاس کر کے رہی ایکشن ہوتا ہے تو یہ سراسر غلط ہے۔ وہ رہی ایکشن پوپ کی اجارہ داری پر تھا۔ ہمارے ہاں اجارہ داری شخص یا طبقے کو نہیں بلکہ دلیل اور قانون کو حاصل ہے۔ آج بھی بڑے سے بڑا عالم کوئی بات کرتا ہے تو اس سے لوگ اختلاف کرتے ہیں کہ نہیں جناب، یہ بات یوں نہیں بلکہ یوں ہے۔ آج بھی کوئی عالم یا کوئی طبقہ اپنی بات کو حتمی اور آخری قرار نہیں دے سکتا۔ اس لیے میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ یہ غلطی پر ہیں، ہمارے ہاں بالکل مختلف صورت حال ہے۔

ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ کیا مولوی کی اجارہ داری ہے کہ بس وہی قرآن کی تشریع کرے گا؟ میں نے کہا، ہماری بالکل بھی اجارہ داری نہیں ہے۔ میں نے کہا، بھی آپ خود قرآن کی تشریع کر لیں۔ پھر میں نے پوچھا، کیا قرآن کریم کی تشریع کے لیے آپ کوئی عربی وغیرہ پڑھیں گے یا نہیں؟ کہنے لگے، بالکل پڑھوں گا۔ میں نے پوچھا، کس درجے کی؟ اخبار کے درجے کی یا قرآن کے درجے کی؟ کہا، قرآن کے درجے کی۔ میں نے پوچھا، جب قرآن کی کسی آیت کی تشریع کریں گے تو آپ اس کا بیک گرا و نہ بھی دیکھیں گے، تاریخ کے حوالے سے بھی یہ پتہ کریں گے کہ یہ آیت کب اور کس موقع پر نازل ہوئی یا اس کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے؟ کہا، ہاں یہ تو پتہ کریں گے۔ پھر میں نے پوچھا، اس آیت کی تشریع کرنے سے پہلے کیا آپ یہ دیکھیں گے کہ اس آیت کی حضور نے بھی کوئی تشریع کی ہے یا نہیں؟ کہا، ہاں دیکھیں گے۔ میں نے کہا کہ جب قرآن کریم کی کسی آیت کی تشریع کے لیے یہ علمی ضروریات آپ پوری کر لیں گے تو آپ تو خود مولوی ہو جائیں گے۔ مولوی کسی نسل کا نام تو نہیں ہے۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک زمانے میں ہمارے ہاں یہ بحث چلتی رہی ہے، خاص طور پر جشن صاحبان میں کہ اجتہاد کا حق علام کو نہیں بلکہ پارلیمنٹ کو ہے۔ جشن جاوید اقبال اس کے سرخیل ہیں۔ میں بھی اخبارات میں اس بحث میں حصہ لیتا رہتا ہوں۔ اس ضمن میں دو مسئللوں کی وضاحت کرتا ہوں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ امت کو ان لوگوں نے تقسیم کر رکھا ہے کہ یہ خنفی ہے، یہ مالکی ہے، یہ شافعی ہے، یہ حنبلی ہے۔ یہ لوگ سب کو گنتے ہیں، جعفری اور ظاہری وغیرہ کو بھی شامل کر

لیتے ہیں۔ اس لیے ان مولویوں کو چھوڑ اور پارلیمنٹ چونکہ عوام کا منتخب ادارہ ہے، اس لیے اجتہاد کا حق پارلیمنٹ کو دے دو۔ ایک بار مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا جی بالکل، یہ حق آپ پارلیمنٹ کو دے دیں۔ باقی علماء نے تو بہت مخالفت کی، جبکہ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، یہ اختیار آپ پارلیمنٹ کو دے دیں۔ لیکن میں نے کہا کہ سوچ لیں، اس وقت تو ہم فقہی اعتبار سے چھ سات فرقوں میں ہیں۔ اہل سنت کے ساڑھے چار ہیں، یعنی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور آدھافرقہ ظواہر کا۔ ظواہر کی اپنی فقہ ہے، اپنا طریقہ استدلال ہے، اپنے اصول ہیں، اپنا اجتہاد کرتے ہیں، ان کے اپنے فتاویٰ ہیں اور امام داؤڈ ظاہری اور امام ابن حزم ان کے امام ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اہل سنت کے ساڑھے چار فرقے ہیں۔ دو اہل تشیع کے ہیں، جعفری اور زیدی۔ میں نے کہا کہ ہم مولویوں نے تو امت کو چھ سات فرقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، لیکن تم جب پارلیمنٹ کو اختیار دے رہے ہو، پارلیمنٹ اجتہاد کرے گی تو مجھے یہ بتائیں کہ پاکستان کی پارلیمنٹ لہنان کی پارلیمنٹ کے اجتہاد کی پابند ہوگی؟ یا مصر کی پارلیمنٹ شام کی پارلیمنٹ کے اجتہاد کی پابند ہوگی؟ تم تو ہمیں کوئی پچاہ سے اوپر فرقوں میں بانٹ رہے ہو۔ آگے چلیے، پاکستان میں قومی اسمبلی کا اپنا دارہ اختیار ہے اور صوبائی اسمبلیوں کا اپنا۔ اب ایسا ہو گا کہ ایک قومی فقہ وجود میں آئے گی، ایک پنجابی فقہ ہو گی، ایک بلوچی فقہ اور ایک سندھی فقہ ہو گی۔ میں نے کہا کہ وہی چھ سات فرقے رہنے دو، تمہاری مہربانی ہو گی۔ ان میں آفاقیت تو ہے نا۔ شافعی انڈونیشیا میں بھی ہیں، مصر میں بھی ہیں۔ تم تو ہر ضلع کی الگ فقہ بنانے پر تلمیز ہوئے ہو۔

ایک دفعہ ایک قومی اخبار کے زیر انتظام لا ہور میں اس موضوع پر ایک مذکورہ ہوا کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق ملنا چاہیے یا نہیں۔ باقی علماء نے کہا کہ نہیں، پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق نہیں ملنا چاہیے، میں نے کہا کہ بالکل ملنا چاہیے۔ سب پریشان ہو گئے کہ ایک مولوی یہ بات کہہ رہا ہے کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق ملنا چاہیے۔ میں نے پھر کہا کہ میں اس بات کے حق میں ہوں کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دے دیا جائے، لیکن ایک چھوٹی سی شرط کے ساتھ۔ جیسا کہ ہر کام کی الہیت کی کچھ شرائط ہوتی ہیں، اجتہاد کی الہیت کی بھی کچھ شرائط ہیں۔ اب ہر آدمی تو اجتہاد کا اہل نہیں ہے۔ میں

نے کہا کہ ایکشن روڈ میں ترمیم کر کے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی اہلیت کی شرط لازمی قرار دے دو، یعنی پارلیمنٹ کا رکن وہ بن سکتا ہے جو اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے تو ہمیں پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جن دنوں یہ مذاکرہ ہوا، ان دنوں اسمبلی میں پندرہ سے بیس علماء ممبر تھے۔ میں نے جب یہ بات کہی تو ایک صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب، ہم ان پندرہ بیس مولویوں سے تنگ ہیں، آپ تو پوری اسمبلی مولویوں سے بھرنے کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے پھر کہا کہ چلو ہم اجتہاد کی شرائط خود طے نہیں کرتے۔ اگرچہ اجتہاد کی شرائط طے شدہ ہیں کہ فلاں فلاں شرائط جس میں پائی جائیں، وہ مجتہد ہے، لیکن پھر بھی آپ کی تسلی کے لیے میں ان پر اصرار نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی تسلی کے لیے ایک طریقہ آپ کو بتاؤ دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ پریم کورٹ میں ریفرنس دائر کریں اور پریم کورٹ سے کہیں کہ وہ اجتہاد کی شرطیں طے کر دے۔ جب پریم کورٹ یہ شرطیں طے کر دے تو آپ ایکشن روڈ میں ترمیم کر کے اسمبلی کی رکنیت کے لیے وہ شرائط لازمی قرار دے دیں۔ میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ میں اس کے حق میں ہم چلاوں گا کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دے دیا جائے۔ میں نے کہا کہ ہم تو دبیل کی، کامن سینس کی اور قانون کی بات کرتے ہیں۔ ہمارا قانون (منصوصات کی حد تک) طے شدہ ہے، اس میں کسی کو رد و بدل کی اجازت نہیں ہے۔ اجتہادی مسائل میں اس کی اجازت ہے، لیکن وہ بھی اس طرح کہ اصل قانون (منصوصات قطعیہ) میں فرق نہ آئے۔

## پوپ کے خلاف بغاوت

بہر حال پوپ کے خلاف بغاوت میں پروٹوٹٹ فرقہ وجود میں آگیا۔ انہوں نے کہا کہ باہل کی تشریع میں پوپ کی اتحارثی اور اجارہ داری ہم نہیں مانتے۔ اس وقت یورپ کی اکثریت پروٹوٹٹ ہے۔ چنانچہ پہلی لڑائی بادشاہ اور جاگیرداروں کے درمیان ہوئی جس میں Magna Carta نامی دستاویز سامنے آئی جس کی رو سے بادشاہ اور جاگیرداروں کے درمیان حقوق طے پائے اور اس میں کچھ عوام الناس کے حقوق کا بھی ذکر تھا، جبکہ دوسرا لڑائی پوپ اور چرچ کے خلاف ہوئی کہ انہوں نے سائنس دانوں اور ماہرین کو باہل اور خدا کے قانون کے خلاف قرار

دے کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس لڑائی کے نتیجہ میں پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا ہوا جس نے بائل کی تشریع میں پوپ کی اجارہ داری مانے سے انکار کر دیا۔

اب میں آتا ہوں تیسری بغاوت کی طرف۔ میں اس وقت گزشتہ پانچ چھ سو سال کی مختصر تاریخ بیان کر رہا ہوں، اس دور کی تاریخ جسے ادوارِ مظلومہ کہتے ہیں، یعنی یورپ کا تاریک دور۔ مغرب والے پاپائیت، بادشاہت اور جاگیرداروں کے اس دور کو انسانیت کا تاریک دور Dark Ages قرار دیتے ہیں۔ وہ دور جس میں بس یہ تینوں ہی مل کر سب کچھ کرتے تھے، عام آدمی مظلوم اور بے بس تھا۔

جاگیردار کے مظالم جب حد سے بڑھ گئے تو پھر لوگوں میں بغاوت پیدا ہو گئی۔ عوام میں جاگیرداروں اور بادشاہ کے خلاف بغاوت اٹھی۔ اس بغاوت میں پوپ نے عوام کا ساتھ دینے کی بجائے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا۔ تینوں ایک دوسرے کے مفادات کے محافظ تھے۔ جہاں پوپ کو ضرورت پڑتی تھی، بادشاہ اس کا ساتھ دیتا تھا اور جہاں بادشاہ کو ضرورت پڑتی تھی، پوپ اس کا ساتھ دیتا تھا۔ اس طرح بادشاہ، جاگیردار اور پوپ میں سے جس کو ضرورت پڑتی تھی، دوسرے اس کا ساتھ دیتے تھے۔ یہ ٹرایکا تھی۔ ان کا آپس میں گل جوڑ تھا اور یہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے اور عوام کو دباتے تھے۔ عوام تو تین چار سو سال ذبح ہوتے رہے۔ بادشاہ بھی خدا کا نمائندہ ہوتا تھا (السلطان ظل اللہ) اور پوپ تو مذہبی طور پر تھا ہی خدا کا نمائندہ۔

یہاں ایک چھوٹی سی بات کرتا ہوں۔ یورپ میں اگر کسی سے آپ مذہب کے اجتماعی کردار کے نام پر کوئی بات کریں گے تو وہ فوراً طیش میں آ جائے گا۔ اس کے طیش میں آنے کی اصل وجہ مغرب کا یہی تاریخی پس منظر ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ یورپ والوں نے مذہب کے نام پر تین چار سو سال انتہائی جبر میں گزارے ہیں۔ بہت ظلم ہوتا تھا، لوگ کاٹ دیے جاتے تھے اور زندہ آگ میں جلا دیے جاتے تھے۔ دو منٹ کی سماut کے بعد ہی پھانسی کا حکم دے دیا جاتا تھا۔ اس لیے جب مغرب والوں سے مذہب کی بات کریں تو وہ ڈر جاتے ہیں کہ یہ لوگ وہی جبر کا دور دا اپس لانا چاہتے ہیں۔ مغرب والوں کی مذہب کے بارے میں کچھ ایسی نفیات بن گئی ہے۔ مذہب

سے ان کی نفرت بلا وجہ نہیں ہے، لیکن ان کی مذہب سے مطلقاً نفرت تو بہر حال غلط ہے۔

جب پوپ نے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا اور یہ تینوں اکٹھے ہو گئے تو اب جو بغاوت ہوئی تو ان تینوں کے خلاف ہوئی۔ یہاں بھی درمیان میں ایک بات عرض کرتا چلوں۔ میں اپنے دانش دروں سے کہا کرتا ہوں کہ بھئی تم لوگ مخالفتے کا شکار ہو۔ پوپ کے خلاف یورپ کے عوام کی نفرت اور بغاوت سمجھ میں آتی ہے۔ دونوں حوالوں سے سمجھ میں آتی ہے۔ باہل کی تشریع میں اجارہ داری کے حوالے سے بھی اور عوام پر ہونے والے ظلم میں بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دینے کے حوالے سے بھی۔ ہم بھی جب وہ تاریخ پڑھتے ہیں تو پچی بات ہے کہ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں کہ یورپ کے عوام نے بادشاہ کے ہاتھوں، پوپ کے ہاتھوں اور جاگیردار کے ہاتھوں اتنا ظلم سہا ہے۔ یہ لوگ تو جانوروں کی طرح زندگی برکرتے رہے ہیں۔ میں اپنے دانشوروں سے کہتا ہوں کہ اس صورت حال کا اطلاق ہم پر نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں تو مولوی ہمیشہ عوام میں رہا ہے۔ یہ فرق ضرور ذہن میں رکھنا۔ ایک بات یہ ہے کہ ہمارے بادشاہوں کے مظالم کا وہ انداز کبھی بھی نہیں رہا۔ شخصی طور پر ظلم ہوتے رہے ہیں۔ اس میں بھی مذہبی طبقے کے کچھ افراد بادشاہوں کے ساتھ ہوتے تھے، لیکن مذہبی طبقہ بحیثیت طبقہ کبھی بھی بادشاہ اور جاگیردار کے ساتھ نہیں رہا۔ مولوی ہمیشہ عوام کے ساتھ رہا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ مولوی بحیثیت طبقہ ہمیشہ عوام کے ساتھ رہا ہے۔ مولوی نے آزادی کی تحریکیں چلائی ہیں، مولوی پھانسی چڑھا ہے، مولوی نے ظالم بادشاہوں کے سامنے کھڑے ہو کر ظلم کے خلاف، آواز بلند کی ہے، مولوی نے تو ہمیشہ لوگوں کے حقوق کی ترجمانی کی ہے۔ ہمارے مذہبی طبقے کی توجودہ سو سالہ تاریخ ہی یہ ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ”تاریخ دعوت و عزیمت“ پڑھ کر دیکھیں جو ہماری چودہ سو سالہ تاریخ کو بیان کرتی ہے۔ ہمارے ہاں مولوی اور صوفی دونوں عوام کے حقوق کی، آزادی کی اور انصاف کی بات کرتے رہے ہیں اور اس میں وہ کئے ہیں، پھانسی چڑھے ہیں، زندہ جلے ہیں۔ میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ ہمارے سندھ میں اگر جاگیرداروں کے سامنے کسی نے آنے کی ہمت کی ہے تو وہ مولوی ہے۔ جھنگ میں جاگیرداروں کے سامنے کون آیا ہے؟ مولوی۔

جہنگ کی تاریخ تین مولویوں کو یاد رکھے گی جنہوں نے جہنگ میں جا گیرداروں کا طلسہ توڑا۔ مولانا محمد ذاکر صاحب، مولانا حق نواز جہنگوی شہید اور مولانا منظور احمد چنیوٹی۔ بلوچستان میں بھی بڑے بڑے نوابوں اور جا گیرداروں سے نکر لینے کی ہمت بھی مولوی ہی کرتا ہے۔ تو میں اپنے دانشوروں سے کہتا ہوں کہ مغرب کے ناریک دور کا اطلاق ہم پر نہ کرو۔ اسلام کا نہ ہی طبقہ تو ہمیشہ عوام میں رہا ہے اور اس نے ہمیشہ عوام کے حقوق کی ترجیحی کی ہے۔

بہر حال جب مغرب میں بغاوت ہوئی تو چونکہ ان کا نہ ہی طبقہ اس بغاوت کے خلاف باادشاہ اور جا گیردار کے ساتھ تھا، اس لیے عوام کی بغاوت پھر ان تینوں کے خلاف ہوئی اور یہ بغاوت ایسی تھی کہ اس نے ان تینوں کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ یہ بغاوت ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک چلتی رہی۔ جلسے، جلوس، تقریریں، جیلیں، پھانسیاں، مقابلے، لڑائیاں اور جنگیں، یہ سب کچھ ہوا اس بغاوت میں۔ بڑی خوفناک تاریخ ہے اس بغاوت کی۔  
یہ تو تھا پہلا مرحلہ جسے یہ میکنا کا رثا کہتے ہیں۔

## انقلاب فرانس کا مرحلہ

اس کے بعد دوسرا مرحلہ انقلاب فرانس تھا۔ یورپ والے کہتے ہیں کہ انسانی حقوق کا آغاز ہمارے ہاں میکنا کا رثا سے جبکہ جمہوری دور کا آغاز انقلاب فرانس سے ہوا۔ انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء میں رونما ہوا۔ اس میں باادشاہ کو اور بڑے بڑے جا گیرداروں کو قتل کر دیا گیا، چرچ کو ختم کر دیا گیا، پارلیمنٹ پر قبضہ ہوا اور لوگوں نے سارا نظام ختم کر کے ایک جمہوری دور کی بنیاد رکھی۔ اس لیے جب جمہوریت کی ابتداء کی بات ہوتی ہے تو اس کا نقطہ آغاز انقلاب فرانس ہوتا ہے۔ اس انقلاب کے بعد ایک اعلامیہ جاری کیا گیا جس کی رو سے باادشاہت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی، جا گیرداری بھی ختم کر دی گئی اور چرچ کے ساتھ یہ کیا گیا کہ چرچ کا عمل دخل اجتماعیت کے معاملات میں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا اور اس سے صرف نہ ہی معاملات تک محدود کر دیا گیا۔ اسی تناظر میں ہم سے بھی کہا جاتا ہے کہ مذہب کا کردار محدود کرو۔ انقلاب فرانس سے پہلے مذہب کی ہر چیز پر اجارہ داری تھی، لیکن انقلاب کے بعد یہ طے پایا کہ پادری کا تعلق صرف فرد کے ساتھ ہے۔

اور وہ بھی عقیدہ، عبادات اور اخلاقیات کی حد تک ہے اور بس۔ جوچ صرف ان تین باتوں کا فائدہ دار ہے۔ باقی سیاست، قانون، عدالت، معيشت اور تجارت وغیرہ میں مذہب کا کوئی کردار نہیں۔ یہ تقسیم انقلاب فرانس کے بعد ہوئی اور یہ تقسیم پوپ، بادشاہ اور جاگیردار کے مظالم کے خلاف رو عمل کے طور پر ہوئی۔ انقلاب فرانس کے بعد مغرب کا نیا فلسفہ سامنے آیا جسے ہیومنزم اور سیکولرازم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

سیکولرازم کی دو بنیادیں ہیں۔ ایک بنیاد یہ ہے کہ مذہب کا اجتماعیت کے معاملات میں کوئی کردار نہیں۔ اس فلسفے کی رو سے مذہب کا کردار صرف تین باتوں تک محدود ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاقیات۔ سیکولرازم کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ سوسائٹی جو بات طے کر دے گی، وہی سُسٹم کی بنیاد ہوگی۔ جمہوریت تو سوسائٹی کی خواہش معلوم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ جمہوریت کوئی فلسفہ یا نظام نہیں ہے۔ جمہوریت میں ووٹ ڈالے جاتے ہیں۔ اکثریت جس طرف ہوگی، بس وہی سوسائٹی کا فیصلہ ہے۔ اکثریت جس چیز کو حلال کہہ دے، وہ حلال ہے اور جس کو حرام کہہ دے، وہ حرام ہے۔ پارلیمنٹ کو جو اجتہاد کا حق دینے کی بات کی جاتی ہے، اس کا پس منظر بھی یہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اصل اتحاری تو پارلیمنٹ کی خود مختاری ہے۔

### شریعت مل اور پارلیمنٹ کی خود مختاری

آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ ہمارے ہاں آج سے کوئی بیس سال پہلے شریعت مل کی ایک تحریک چلی تھی۔ ہم نے خود چلائی، اس کے لیے کام کیا۔ ہمارے دو علماء مولانا سمیح الحق اور قاضی عبداللطیف نے سینیٹ میں یہ بل پیش کیا اور اس پر بحث ہوئی۔ اس بل کی بنیادی دفعہ یہ تھی کہ قرآن و سنت کو ملک کے پریم لا کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ بات طے ہو جائے گی کہ قرآن و سنت ملک کے بالادست قانون کی حیثیت رکھتے ہیں تو پھر باقی تمام قوانین ان کے تابع ہو جائیں گے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے میں آپ کو ایک چھوٹا سا حوالہ دیتا ہوں۔

قرارداد مقاصد میں بھی یہی بات لکھی ہے۔ قرارداد مقاصد بطور دیباچہ کے ہمارے دستور میں ہمیشہ شامل رہی ہے۔ قرارداد مقاصد کے ذریعے ہماری سیاست نے کلمہ پڑھا تھا۔ قرارداد مقاصد

لیاقت علی خان مرحوم کے زمانے میں دستور ساز اسمبلی نے پاس کی تھی جس کا دو جملوں میں خلاصہ یہ ہے کہ حاکیتِ اعلیٰ اللہ کی ہے، حکومتِ عوام کے منتخب نمائندے کریں گے، لیکن وہ اللہ اور رسول کے احکام کے پابند ہوں گے۔ یعنی عوام کے منتخب نمائندے مطلق الغنان نہیں ہوں گے بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کے دائرے کے اندر رہ کر حکومت کریں گے۔ قرارداد مقاصد کے ذریعے ہم نے یہ اصول طے کر لیا۔ یہ قرارداد مقاصد ۱۹۵۶ء کے دستور میں شامل رہی، پھر ۱۹۶۲ء کے دستور میں بھی شامل رہی، ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی شامل رہی اور اب بھی شامل ہے۔ جزئی ضیاء الحق مرحوم نے اس سلسلے میں ایک کام کیا۔ پہلے تو قرارداد مقاصد دستور کا ایک دیباچہ تھا۔ دیباچہ ایسے ہوتا ہے جیسے کوئی چیز تبرکار کھدی گئی ہو، یعنی آئین اس سے شروع نہیں ہوتا تھا بلکہ آئین سے پہلے برکت کے لیے دستور میں شامل تھی۔ ضیاء الحق مرحوم نے ایک کام کیا کہ اسے دیباچہ سے نکال کر آئین کے اندر شامل کر دیا۔ یہ کام اس نے بڑے تکنیکی طور پر کیا کہ اس کا نمبر فلان نہیں بلکہ فلاں شمار ہوگا، لیکن نتیجے کے طور پر قرارداد مقاصد آئین کا حصہ بن گئی۔ قرارداد مقاصد کی رو سے ہماری ریاست نے کلمہ پڑھا کہ ہم خدا کو حاکمِ اعلیٰ مانتے ہیں۔ ہم تو بہت خوش ہوئے کہ ہمارے لیے اب جنگ آسان ہو گئی۔ اب ہم قوانین کو عدالت میں چیلنج کرتے جائیں گے کہ یہ قانون دستور کے خلاف ہے اور یہ قانون دستور کے خلاف ہے اور اس طرح ہم چند سالوں میں ملک کے مروجہ قوانین کو اسلامی قوانین سے بدل دیں گے، لیکن سپریم کورٹ نے اس کا بیڑا ہی غرق کر دیا۔

ہوایوں کہ شرعی قانون کے مطابق قتل کے قصاص کو معاف کرنے کا حق صرف مقتول کے ورثا کو ہے، لیکن پاکستان کے قانون میں یہ اختیار صدر کو بھی حاصل ہے۔ قانون کے مطابق سزاۓ موت کا مجرم صدر سے رحم کی اپیل کر سکتا ہے۔ صدر اگر اس اپیل کو منظور کر لے تو اس مجرم کو سزاۓ موت نہیں دی جاتی۔ اس پر لا ہور ہائیکورٹ میں ایک رٹ دائر ہوئی کہ صدر کا یہ اختیار شرعاً جائز نہیں ہے اور قرارداد مقاصد کی رو سے ہم پابند ہیں کہ ہم اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہیں چلیں گے، اس لیے صدر کا یہ اختیار دستور کے خلاف ہے، لہذا صدر کا یہ اختیار ختم کر دیا جائے۔ اس پر لا ہور ہائی

کورٹ نے فیصلہ دے دیا کہ صدر کو کسی کی سزاۓ موت معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے اور یہ فیصلہ اس بنیاد پر دیا کہ قرارداد مقاصد کے ذریعے چونکہ قرآن و سنت کو بالا دست حیثیت حاصل ہے اور صدر کا یہ اختیار قرآن و سنت کے خلاف ہے، اس لیے صدر کا یہ اختیار ختم کیا جاتا ہے۔

پاکستان کے قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے میں یہ ایک بڑی پیش رفت تھی۔ اس کے بعد ہائی کورٹ کا یہ فیصلہ سپریم کورٹ میں چلنج کر دیا گیا۔ سپریم کورٹ کے فل بخش نے، جس کے سربراہ جسٹس نیم حسن شاہ تھے، ہائیکورٹ کا فیصلہ یہ کہہ کر منسوخ کر دیا کہ قرارداد مقاصد کو آئین میں کوئی بالاتر حیثیت حاصل نہیں ہے۔ یہ بھی عام دفعات کی طرح ایک دفعہ ہے۔ اب یہ عدالت کی مرضی ہے کہ دستوری دفعات میں تضاد کی صورت میں وہ کس دفعہ کو کس دفعہ پر ترجیح دیتی ہے۔ سپریم کورٹ کے فل بخش نے، جو قانون کی تشریع میں ہمارے ہاں آخری اتحارٹی ہوتا ہے، یہ فیصلہ دیا اور صدر کا سزاۓ موت ختم کرنے کا اختیار دوبارہ بحال ہو گیا۔

میں شریعت بل کی بات کر رہا تھا۔ شریعت بل میں یہ دفعہ تھی کہ قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لا قرار دیا جائے۔ اس پر جو سب سے بڑا اعتراض تھا، وہ یہ تھا کہ اس سے پارلیمنٹ کی خود مختاری متاثر ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ کا تصور یہ ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتی ہے اور اسے قرآن و سنت کا پابند کرنے کا مطلب اس کے اختیارات کو محدود کرنا ہے۔ اسی لیے آج مغرب اور مغرب کے نمائندے یہ کہہ رہے ہیں کہ پارلیمنٹ کی خود مختاری بحال کریں۔ یہ بہت سادہ سا جملہ ہے۔ عام آدمی تو یہ سمجھتا بھی نہیں کہ اس کے پیچھے اصل بات کیا ہے۔ یہ تو ہم لوگ جو مبتلى ہیں، ہمیں پتہ ہے کہ پارلیمنٹ کی مطلق خود مختاری سے ان کا مطلب کیا ہے۔

## سیکولر ازم کی دو بنیادیں

میں سیکولر ازم کی دو بنیادوں پر بات کر رہا ہوں۔ ایک بنیاد تو یہ کہ مذہب کا سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ دوسری بنیاد یہ کہ فیصلوں میں اتحارٹی عوام یا ان کے منتخب نمائندے ہوں گے۔ سوسائٹی فیصلہ کرے گی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس حوالے سے آج کل ایک بہت خوبصورت ساعنوں سامنے آتا ہے، ”سول سوسائٹی“۔ اب سول سوسائٹی کس بلا کا نام ہے؟

یہ سول سو سائیٹی وہی مغرب کی خرافات ہے جو یہ لوگ یہاں مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم ان لوگوں کے عنوانات کو اور ان کی اصطلاحات کو بھی سمجھ نہیں پاتے اور ہمیں یہی پستہ نہیں چلتا کہ کون کس بینڈ سے بول رہا ہے اور کیا بول رہا ہے۔ سول سو سائیٹی کا مطلب یہی ہے کہ جس طرح مغرب میں سو سائیٹی اپنی خواہشات کے مطابق فیصلہ کرنے میں اتحاری ہے اسی طرح ہمارے ہاں بھی ہونا چاہیے۔ جبکہ ہم سو سائیٹی کو منصوصات میں اتحاری نہیں مانتے۔ ہم سو سائیٹی کی خواہشات کا مطلقاً انکار نہیں کرتے، لیکن ہم سو سائیٹی کی خواہشات کے نام پر، پارلیمنٹ کی خود مختاری کے نام پر قرآن و سنت کی نفی کے متعلق تو ہم سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ تو سیکولر ازم کا معنی یہ ہے کہ فیصلہ کرنے میں اتحاری سو سائیٹی ہوگی، وہ جو چاہے فیصلہ کرے۔ حلال کرے، حرام کرے، جو مردی کرے، اسے کوئی چیز کرنے والا نہیں اور یہ کہ مذہب کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

### دو پادری صاحبان سے گفتگو

یہاں ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا۔ امریکہ کا ایک شہر ہے اٹلانٹا۔ وہاں ہمارے ایک دوست افخار رانا رہتے ہیں۔ پہلے پاک فوج میں میجر تھے، اب کافی عرصہ سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ میں ان کے ہاں ٹھہر اہوا تھا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ یہاں کوئی سمجھدار سا پادری ہو تو اس سے میری ملاقات کرواؤ۔ چنانچہ افخار رانا صاحب نے وہاں کے پیش فرقے کے سربراہ سے میری ملاقات کروائی۔ افخار ہمارے درمیان ترجیح تھے۔ افخار نے انہیں میرے متعلق بتایا کہ پاکستان سے مسلمانوں کے ایک مذہبی راہ نما یہاں آئے ہوئے ہیں۔ میں نے پادری صاحب سے کہا کہ میرے بھائی! یہ جو آپ کی امریکہ کی سو سائیٹی ہے، اس میں آپ لوگوں نے مذہب کو بالکل اپنی زندگیوں سے بے دخل کر دیا ہے۔ لوگ شراب پیتے ہیں، زنا کرتے ہیں، جو اکھیتے ہیں، کھلم کھلا ہم جنس پرستی کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں ان معاملات میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آپ ایک مذہب کے نمائندہ ہیں۔ باطل شراب کو حرام کہتی ہے، زنا کو حرام کہتی ہے۔ نوے فیصلہ قوانین و احکام قرآن اور باطل کے ایک جیسے ہیں۔ آپ لوگ اس

سلسلے میں کیا کر رہے ہیں؟ میں نے پادری صاحب سے کہا کہ زنا، شراب، جوا، سود، ہم جنس پرستی، یہ سب چیزیں آپ کے ہاں بھی حرام ہیں۔ آپ لوگ ایک مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں، اپنے معاشرے کی اصلاح کے لیے کیا کر رہے ہیں؟

پادری صاحب امریکہ کے دستور کے حوالے سے بات کرنے لگے تو میں نے کہا کہ امریکہ کے دستور کا تو مجھے بھی پتہ ہے، ہم اس وقت دستور کی بات نہیں کر رہے۔ میں تو آپ کی بات کر رہا ہوں، باسل کے نمائندے کی بات کر رہا ہوں۔ کہنے لگے کہ میں اتوار کو ایک درس دیتا ہوں جس میں جو بھی لوگ آتے ہیں، میں ان کو باسل کی تعلیمات سے آگاہ کرتا رہتا ہوں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ درس میں کوئی ڈیڑھ دو سو لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کل آپ جب حضرت عیسیٰ (Jesus) کے سامنے پیش ہوں گے تو کیا آپ اس بات سے انہیں مطمئن کر لیں گے کہ اثاثا کی دس لاکھ کی آبادی میں آپ چند سو لوگوں کو اتوار کے دن ایک مختصر سے درس میں باسل کی تعلیم دیتے رہے؟ اس پر پادری صاحب نے بے چارگی سے کہا کہ میں اس سلسلے میں اور کیا کر سکتا ہوں؟

میں نے پادری صاحب سے کہا کہ میں آپ سے ایک مذہب کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اپنے معاشرے میں اسی کردار کی توقع کر رہا ہوں جو میں اپنے معاشرے میں ادا کر رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ ہم اپنے معاشرے میں خدائی احکامات کی خلاف ورزی کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔ آپ کے ہاں تو یہ بات نافذ ہو چکی ہے کہ مذہب کا سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ باسل لا تعلق، چدق لا تعلق، پادری لا تعلق، جبکہ ہمارے ہاں یہ نافذ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ہم اس کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہیں۔ ہمیں اسمبلی میں موقع ملتا ہے تو اسمبلی میں مزاحمت کرتے ہیں، بازار میں موقع ملتا ہے تو بازار میں کرتے ہیں، منبر پر موقع ملتا ہے تو منبر پر کرتے ہیں، اخبار میں موقع ملتا ہے تو اخبار میں کرتے ہیں۔ ہم نے تو ایک شور مچایا ہوا ہے کہ ہم سوسائٹی کو خدائی احکامات و قوانین سے منہ نہیں موڑنے دیں گے۔ ہم لوگ اس ذہن کی مزاحمت کر رہے ہیں کہ مذہب کا تجارت، سیاست، معيشت، عدالت اور دیگر کاروبار زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔

میں نے پادری صاحب سے کہا کہ آپ لوگ بھی اس کی معاشرتی سطح پر مزاجمت کریں۔ سیکولر ازم یعنی مذہب کی ہمارے اجتماعی معاملات میں بے دخلی کا فلسفہ تمہارا بھی دشمن ہے اور ہمارا بھی دشمن ہے۔ کیا مولوی اور پادری اس کے خلاف اکٹھے نہیں ہو سکتے؟ یہ جو مذہب سے دستبرداری اور مذہب کی بے دخلی ہے، اس کے خلاف ہم مل کر جنگ کرتے ہیں۔ جب ہم لوگ اس فلسفے کو شکست دے دیں گے تو تم اپنے معاشرے میں باسل نافذ کر دینا، ہم اپنے معاشرے میں قرآن نافذ کر دیں گے۔ ظاہر ہے عیسائیوں میں تو باسل ہی نافذ ہو گی، قرآن تو مسلمانوں میں نافذ ہو گا۔ مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہماری بات چیت کے دوران ہی میرے دوست جو ہماری ترجمانی کر رہے تھے، مذاق سے کہنے لگے: ”کیوں مرداو ایس ایسوں؟“ یعنی کیوں اس غریب کو مرداوازا ہے۔ پادری صاحب کہنے لگے کہ آپ تو عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ ہم نے مسلمانوں سے ایسی باتیں پہلے کبھی نہیں سنیں۔ میں نے کہا، میں بالکل سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ ایک فورم پر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جب ہم یہ جنگ جیت جائیں تو مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ تم امریکہ میں باسل نافذ کر دینا، لیکن پھر میں بھی یہ حق مانگوں گا کہ پاکستان میں قرآن نافذ کروں۔

یہ جو میں نے قصہ سنایا، یہ امریکہ کے ایک پادری صاحب تھے۔ اب برطانیہ کے ایک پادری صاحب کا قصہ سناتا ہوں۔ نونگھم برطانیہ کا ایک بڑا شہر ہے۔ ہم نے وہاں کے ایک بڑے پادری صاحب سے گپ شپ کرنے کا پروگرام بنایا۔ مولا نا عیسیٰ منصوری، مولانا رضا الحق، مفتی برکت اللہ اور میں خود تھا۔ ہم لوگوں نے پادری صاحب سے وقت لیا اور ان سے ملنے چلے گئے۔ ان سے بھی میں نے بھی بات کی کہ جس معاشرے میں آپ لوگ مذہب کے نمائندے ہیں، یہاں زنا، عریانی، شراب، ناج گانا، سود، جوا، ہم جنس پرستی اور ان جیسے دوسرے فتح کام کھلے عام ہو رہے ہیں۔ نفسانی خواہشات کی حکمرانی ہے اور خدائی حدود کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ آپ لوگ مذہب کی، چرچ کی، باسل کی، Jesus کی، خدا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آپ لوگ اس معاشرے کی اصلاح کے لیے کیا سوچ رہے ہیں؟ کہنے لگے کہ ظاہر ہے یہ بالکل غلط ہو رہا ہے۔

یہ خدا اور Jesus سے بغاوت ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اس کا کوئی حل ہے؟ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ پادری صاحب کی بات دھراتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس تو اس کا کوئی حل نہیں ہے، ہم تو آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ جو چیک اور روشنی ان مسائل کے حل کے لیے درکار ہے، وہ میں آپ لوگوں کی آنکھوں میں نظر آ رہی ہے۔

میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ جو مغرب کے پڑھے لکھے بھگدار پادری صاحبان ہیں، ان میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو تلاش میں ہیں، انتظار میں ہیں کہ ان سے اس مسئلے پر بات چیت کی جائے، بلکہ وہ تو ہماری طرف دیکھ رہے ہیں کہ ہم ان کی رہنمائی کریں۔ وہ ہمیں مذہب کے معاملات میں سینٹر سمجھتے ہیں اور یہاں ہم ہیں کہ ہم سے اپنے لوگوں کی رہنمائی نہیں ہو پا رہی۔

### اقوام متحده کا انسانی حقوق کا چارٹر

حضراتِ محترم! ہمارا موضوع ہے: اقوام متحده کا انسانی حقوق کا چارٹر اور اسلامی تعلیمات۔ میں نے اس کا پس منظر آپ کے سامنے بیان کیا ہے کہ اصل میں یہ جھگڑا کیا ہے۔ اس پس منظر میں ہم اب تک انقلاب فرانس تک پہنچے ہیں جسے انسانی حقوق کی دوسری دستاویز قرار دیا جاتا ہے۔ انسانی حقوق کی پہلی دستاویز میکنا کارٹا (۱۷۸۹ء) کو جبکہ دوسری دستاویز انقلاب فرانس کے نتیجے میں (۱۷۸۹ء) تیار ہونے والی دستاویز "انسان کے حقوق کا اعلامیہ" (Declaration of the Rights of Man) کو کہا جاتا ہے۔ یہ ۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس کے بعد جاری ہوا۔ اسی کی بنیاد پر اب تک انسانی حقوق کے حوالے سے یہ سارا قصہ چلا آ رہا ہے۔ اس کی رو سے مذہب کی اور جاگیرداری کی تو چھٹی ہو گئی۔ بادشاہ اگر ہے بھی تو بے اختیار ہے، جبکہ سارے اختیارات سوسائٹی کو منتقل ہو گئے اور سوسائٹی یا اس کے منتخب نمائندے اتحاری بن گئے۔ یہ جمہوریت کا نقطہ آغاز ہے۔ گویا مغربی جمہوریت کی تاریخ کوئی سواد و سوال پرانی ہے۔

انقلاب فرانس کے بعد تیسرا بڑی دستاویز اقوام متحده کا انسانی حقوق کا چارٹر ہے۔ اس درمیانی عرصہ میں اور بھی چھوٹے موئے کنٹریکٹس بنتے رہے، لیکن ایک جامع دستاویز کے طور پر اقوام متحده کے انسانی حقوق کے چارٹر کو اس سلسلے کی تیسرا بڑی دستاویز شمار کیا جاتا ہے۔ یہ چارٹر اقوام متحده

نے تیار کیا اور جزل اسمبلی نے اسے ۲۰ دسمبر ۱۹۳۸ء کو منظور کیا۔ یہ چارٹر میں دفعات پر مشتمل ہے جس پر ہم بعد میں بات کریں گے، لیکن اس سے پہلے دو باتیں واضح کرنا چاہوں گا۔ پہلی یہ کہ اقوام متحده دراصل کیا ہے۔ دوسری یہ کہ اس انسانی حقوق کے چارٹر کی اخلاقی و قانونی حیثیت کیا ہے۔ ان دونوں کی وضاحت کے بعد ہم انسانی حقوق کے چارٹر کی طرف آئیں گے۔

۱۹۱۴ء کے لگ بھگ پہلی جنگ عظیم ہوئی۔ دنیا کے ممالک آپس میں نکرانے۔ ہمارا بھی اس جنگ عظیم میں ایک کردار تھا۔ اس کردار کی ہمیں سزا بھی مل رہی ہے۔ اس جنگ میں جمنی ایک طرف تھا جبکہ باقی یورپ دوسری طرف تھا۔ اس وقت خلافت عثمانیہ قائم تھی جس کا مرکز ترکی تھا۔ خلافت عثمانیہ نے سپر پاور کے طور پر دنیا میں تقریباً ساڑھے چار سو سے پانچ سو سال گزارے ہیں۔ درمیان میں دو صدیاں تو تقریباً ایسی رہی ہیں کہ اس وقت امریکہ کو دنیا میں جو پوزیشن حاصل ہے، وہی پوزیشن سلطنت عثمانیہ کو دنیا میں حاصل رہی ہے۔ اس وقت جیسے امریکہ کا واسطہ ہاؤس ہے، اس طرح سلطنت عثمانیہ کا ہیڈ کوارٹر باب عالی کے نام سے ہوا کرتا تھا۔ باب عالی کی مرضی کے بغیر دنیا میں کوئی چیز حرکت نہیں کرتی تھی۔ امریکہ تو چند سالوں میں تحکم گیا ہے، جبکہ ہم نے صدیوں اس پوزیشن پر اپنا کردار ادا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ ہمارا الگاراؤ نڈ بھی آنے والا ہے۔ یہ درمیان میں مارکھانے کا بھی ایک پیریڈ آگیا ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے بعد برطانیہ نے دنیا میں سپر طاقت کے طور پر راج کیا ہے۔ برطانیہ ایک صدی میں تحکم گیا تھا، روپن صدی میں، جبکہ امریکہ تو اس سے بھی جلدی تحکم رہا ہے۔ امریکہ کے بعد ادب کسی اور کی باری ہے جس سے ہم نے ابھی مارکھانی ہے، لیکن اس کے بعد پھر ہماری باری ہے، ان شاء اللہ العزیز۔ بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے۔

پہلی جنگ عظیم میں بہت تباہی ہوئی جس کے بعد انجمن اقوام (League of Nations) کے نام سے ایک ادارہ بنا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک سادہ سافلسفہ آپ کو بتاتا ہوں کہ جب عام لوگ آپس میں لڑ پڑتے ہیں تو ان میں پولیس، عدالتیہ وغیرہ تصفیہ کرواتی ہے۔ ادارے آپس میں لڑ پڑیں تو حکومت ان میں صلح صفائی کرتی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ حکومتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی

صلح کون کروائے؟ تو انجمن اقوام ایک ایسا ادارہ بنایا کہ ممالک آپس میں لڑ پڑیں تو ایک ادارہ ایسا ہو جو لڑائی کو روکے، جھگڑے نمٹائے اور صلح کروائے۔ انجمن اقوام کچھ عرصہ چلی، لیکن ناکام ہو گئی۔  
اس پر علامہ اقبال نے یوں تبصرہ کیا تھا کہ:

من ازیں بیش نداشم کہ کفن دزوے چند  
بہر تقسیم قبور انجنے ساختہ اند

یعنی گورکنوں نے قبروں کی تقسیم کے لیے ایک انجمن بنائی ہے کہ یہ قبریں میں نے کھودنی ہیں اور یہ قبریں تم نے کھودنی ہیں۔ وہ انجمن ناکام ہو گئی کہ اس کی موجودگی میں بھی دوسری جنگ عظیم ہو گئی۔ بڑی خوفناک جنگ ہوئی۔ یورپ میں، ایشیا میں، افریقہ میں بہت تباہی پھیلی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس سے زیادہ مضبوط بیانی دوں پر اقوام متحده بنائی گئی۔

### اقوام متحده کا قیام

اقوام متحده ۱۹۴۵ء میں بنی۔ اس کے قیام کا بنیادی مقصد ہے اقوام اور ممالک کے درمیان تنازعات کو حل کرنا، تصادم کے امکانات کو روکنا، اگر تصادم ہو جائے تو درمیان میں ثالثی اور تحکیم کا کردار ادا کرنا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اقوام متحده نے یہ دیکھا کہ یہ جھگڑے ہوتے کیوں ہیں، ان کی وجہات کیا ہیں۔ کچھ اصول ہونے چاہئیں جو یہ طے کریں کہ یہ بات انصاف کی ہے اور یہ بات نا انصافی کی ہے۔ فلاں بات صحیح ہے اور فلاں غلط ہے۔ چنانچہ اس میں انہوں نے اپنا فلسفہ زندگی بھی شامل کر لیا۔ اس سلسلے میں یہ چار ٹرمذور کیا گیا اور طے پایا کہ اب دنیا میں تمام تنازعات، مقدمات اور معاملات اس منشور کی بنیاد پر طے ہوا کریں گے۔ اسے آپ ایک بین الاقوامی دستور سمجھ لیجیے کہ اقوام و ممالک کے آپس کے تنازعات اب اس دستور کی روشنی میں طے کیے جائیں گے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ایک آدھ ملک کو چھوڑ کر دنیا کے تمام ممالک اقوام متحده کے ممبر ہیں۔ ہم بھی ممبر ہیں۔

اقوام متحده کا ڈھانچہ کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک جزل اسٹبلی اور ایک سلامتی کونسل ہے۔ جزل اسٹبلی کا ہیڈ کوارٹر امریکہ کے شہر نیویارک کے ایک جزیرہ میں ہیٹن (Manhattan) میں

ہے۔ اس کے کچھ دفاتر سوئزر لینڈ کے شہر جنیوا میں بھی ہیں۔ جزل آسمبلی کا ہر سال اجلاس ہوتا ہے جس میں اس کا ہر بھر شریک ہوتا ہے۔ وہاں لمبی تقریریں ہوتی ہیں اور یہ دنیا کا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس پر دنیا کے کسی بھی ملک کا حکمران آ کر جو مرضی کہہ دے۔ یہ سمجھ لیں کہ انٹرنیشنل ہائیڈ پارک کارز ہے۔ اصل ہائیڈ پارک کارز تو لندن میں ہے۔ لندن کے وسط میں ایک بہت بڑا باعث ہے۔ اس باعث میں ایک کونہ ایسا ہے کہ اس میں کوئی بھی آدمی کسی بھی وقت جا کر کوئی بھی تقریر کر سکتا ہے۔ یہ ایک بہت مزے کی جگہ ہے۔ وہاں پر کوئی قانون لا گو نہیں ہوتا۔ آپ وہاں جا کر برطانیہ کی بادشاہت کے خلاف بات کریں، عیسائیت کے خلاف کریں، دستور کے خلاف کریں، وزیر اعظم کے خلاف کریں، آپ چاہے وہاں گالیاں دیں، جو مرضی کہہ دیں، آپ کو پوری آزادی ہے۔ ہم کبھی بھی وہاں شام کو جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ کوئی آدمی ایک جگہ کھڑا تقریر کر رہا ہے، کوئی دوسری جگہ کھڑا اپنی ہانک رہا ہے۔ ایک عجیب تماشا لگا رہتا ہے۔ اسے ہائیڈ پارک کارز کہتے ہیں۔ اس کو نے میں کوئی قانون لا گو نہیں ہوتا۔ جس کا جب جی چاہے، وہاں اپنے دل کا غبار نکال لے۔ عام منظر یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص تین آدمی لے کر ایک جگہ کھڑا ہے، کوئی چار آدمی لے کر کھڑا ہے، کسی کے حصے میں ذرا زیادہ لوگ آ جاتے ہیں جنہیں وہ اپنی تقریر سنارہ ہوتا ہے۔ کوئی امریکہ کے خلاف، کوئی اسلام کے خلاف، کوئی عیسائیت کے خلاف، جس کا جس کے خلاف جی چاہتا ہے، اپنی بھڑاس نکال رہا ہوتا ہے۔ تو میں اقوام متعدد کی جزل آسمبلی کو انٹرنیشنل ہائیڈ پارک کارز کہا کرتا ہوں۔

ستمبر میں جزل کوسل کا اجلاس شروع ہوتا ہے جو تین مہینے تک جاری رہتا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک کے نمائندے وہاں بیٹھتے ہیں۔ کسی بھی ملک کے صدر، وزیر اعظم یا نمائندے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہاں جا کر تقریر کرے اور جو مرضی کہے۔ یعنی ہر ملک وہاں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کر سکتا ہے۔ یہ تو جزل آسمبلی کی پہلی حیثیت ہے۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ جزل آسمبلی کسی مسئلے پر کوئی قرارداد بھی پاس کر سکتی ہے، لیکن اس قرارداد کی حیثیت بس سفارش کی ہوتی ہے۔ اس وقت جزل آسمبلی میں بے شمار قرارداد ایس پڑی ہوئی ہیں۔ اسرائیل کے خلاف بے شمار ہیں، انڈیا کے

خلاف ہیں، اور بھی ملکوں کے خلاف بھی ہیں۔ بس وہیں پڑی ہوئی ہیں۔ ان قراردادوں کی حیثیت سفارش سے زیادہ نہیں ہے۔ جز ل اس بیلی کا مقصد ایک تو دنیا کے ممالک کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے جس پر وہ اپنے دل کا غبارہ کال سکیں اور دوسرے کی مسئلے پر اپنی سفارش پیش کرنا ہے۔

اقوام متحده کا اصل ادارہ سلامتی کونسل ہے۔ اس کے پانچ مستقل اور چھ غیر مستقل ممبر ہوتے ہیں۔ پانچ مستقل ممبر جو ہیں، وہ ہمیشہ یہی رہیں گے۔ امریکہ، برطانیہ، روس، چین اور فرانس۔ اور چھ ممبر غیر مستقل ہوتے ہیں جو دو سال کے عرصے کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ اس کے گروپ تقسیم ہیں کہ اس دفعہ افریقہ سے ممبر آئے گا اور اس دفعہ ایشیا سے آئے گا۔ دنیا کے ممالک ووٹ دے کر اپنا نمائندہ ملک منتخب کرتے ہیں۔ تو سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ممبر ہیں جبکہ چھ غیر مستقل ہیں جو ہر دو سال کے بعد بدلتے رہتے ہیں۔ پانچ مستقل ممبرز کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ رہیں گے، ان کو دنیا کے ممالک سے ووٹ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ ان کو ویٹو پاور حاصل ہے۔ جز ل اس بیلی کی حیثیت تو بس قراردادیں منظور کرنے کی ہے جبکہ سلامتی کونسل کی حیثیت یہ ہے کہ وہ جو فیصلہ کر دے، وہ دنیا میں نافذ ہوتا ہے۔ یہ جو دنیا کے مختلف ممالک کے خلاف فوجیں بھیجی جاتی ہیں، اقتصادی ناکہ بندیاں ہوتی ہیں اور بمباریاں ہوتی ہیں، یہ سب سلامتی کونسل کے فیصلوں کے نتیجے میں ہوتی ہیں۔ پانچ مستقل ممبرز کو ویٹو پاور حاصل ہے جسے حق استرداد کہتے ہیں۔ یعنی گیارہ ممبر بیٹھ کر کوئی فیصلہ کریں تو ان پانچ مستقل ممبرز میں سے کوئی بھی اس فیصلے کو رد کر سکتا ہے۔ بس وہ فیصلہ ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کا نظام چلانے کے لیے کسی بھی مسئلے پر ان پانچ مستقل ممبرز کا اتفاق ضروری ہے۔ باقی سب رسی کارروائی ہے۔ اصل طاقت ان پانچ ممالک کے پاس ہے۔ اگر کسی مسئلے پر ان پانچ ممالک میں سے کوئی ایک متفق نہ ہو تو پھر چاہے ساری جز ل اس بیلی ایک طرف ہو جائے اور سلامتی کونسل بھی اس کے ساتھ ہو جائے، وہ فیصلہ نافذ نہیں ہوتا۔

## اقوام متحده اور اسلامی دنیا

اقوام متحده کا یہ نظام ۱۹۴۵ء سے چلا آ رہا ہے۔ اقوام متحده کے ڈھانچے کے حوالے سے

ہمارے دو تحفظات ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ جو پانچ مستقل ممبر ہیں جن کے ہاتھ میں اصل پاور ہے، جن کے فیصلے پوری دنیا میں نافذ ہوتے ہیں، جن کو فیصلہ کرنے یا فیصلہ کو مسترد کرنے کا اختیار حاصل ہے، ان میں ایک بھی مسلمان ملک نہیں ہے۔ اقوام متحده کے اٹھاؤں مسلمان ممبر ملکوں میں سے کوئی بھی اس میں شامل نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فیصلہ سازی میں ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہم دنیا کی آبادی کا اگر چوتھا نہیں تو پانچواں حصہ ضرور ہیں۔ دنیا کی آبادی کا اتنا بڑا حصہ ہونے کے باوجود ہماری اقوام متحده کی فیصلہ سازی میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اتنی اہمیت ہونے کے باوجود فیصلہ سازی کے عمل میں ہماری کوئی شرکت نہیں ہے۔ ملائیشیا کے سابق حکمران مہاتیر محمد نے متعدد بار یہ مسئلہ اٹھایا کہ کوئی فارمولاطے کر کے مسلمانوں کو اس پانچ کے گروپ میں شامل کیا جائے، لیکن ان کے علاوہ مسلم ممالک میں سے کوئی یہ آزاد نہیں اٹھاتا۔

ہمارے دو تحفظات میں سے دوسرا یہ ہے کہ اقوام متحده کا انسانی حقوق کا چارٹر جسے ایک بین الاقوامی معیار بنایا گیا ہے، یہ ۱۹۴۸ء میں جس وقت طے ہوا تھا، اس وقت اقوام متحده میں ہماری نمائندگی مکمل نہیں تھی۔ مسلم ممالک اکثر غلام تھے، آزاد نہیں تھے۔ اس چارٹر میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہمارے مذہب اور ثقافت سے متصادم ہیں۔ اس پر بھی مہاتیر محمد نے آواز اٹھائی کہ اس چارٹر پر نظر ثانی ہونی چاہیے۔ اسلامی ولی نقطہ نظر سے اقوام متحده کا چارٹر مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ عملًا تو ہم نے اس کی پابندی قبول کی ہوئی ہے، لیکن نظریے اور شرعی اعتبار سے تبھی قابل قبول ہو سکتی ہے جب ہماری یہ دو باتیں مانی جائیں۔ ایک یہ کہ فیصلہ سازی میں ہماری کوئی حیثیت ہو۔ دوسرا یہ کہ انسانی حقوق کے چارٹر پر نظر ثانی ہو کیونکہ اس میں کچھ باتیں اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی اقدار سے متصادم ہیں۔ جس طرح دنیا کے باقی معتقدات کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس طرح اس چارٹر میں ہمارے معتقدات کا لحاظ بھی رکھا جائے اور ہمارے ساتھ مشاورت سے اس پر نظر ثانی ہو جائے۔ تب اقوام متحده کی رکنیت ایک بین الاقوامی معاہدے کے درجے میں ہمیں قابل قبول ہو سکتی ہے۔

اقوام متحده اس وقت دنیا کے تقریباً تمام شعبوں میں حاوی ہے۔ اقوام متحده کے شعبوں میں

تعلیم، صحت، ہیومن رائٹس، معیشت وغیرہ کے شعبے نمایاں ہیں۔ اقوام متحده کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ ایک بین الاقوامی اخلاقی معاهدہ ہے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معہدے کی خلاف ورزی پر دنیا کے ملکوں کے خلاف اقتصادی ناکہ بندیاں، جنگی کارروائیاں اور فوج کشیاں ہوتی ہیں، حکومتیں تک ختم کر دی جاتی ہیں۔ اس معہدے کی کسی بات کی خلاف ورزی پر سلامتی کو نسل دنیا کے ملکوں کے خلاف فیصلے کرتی ہے اور اس کے فیصلے عملاً نافذ ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نہیں سمجھتا کہ اس کو اخلاقی معہدہ کہا جائے۔ میں اسے Undeclared International Constitution کہتا ہوں۔ اقوام متحده غیر علائی یعنی عملًا ایک حکومت ہے اور اس کا چار ٹر عملًا بین الاقوامی دستور ہے۔ قانونی اور اخلاقی معہدہ میں تو یہی فرق ہوتا ہے کہ قانون کی خلاف ورزی پر کارروائی کی جاتی ہے جبکہ اخلاقی معہدہ کی خلاف ورزی پر کوئی کارروائی نہیں کی جاتی۔

## ہیومن رائٹس کے چار ٹر کی بنیاد

اقوام متحده کے تعارف میں یہ لکھا ہے کہ اقوام متحده کی رکنیت تمام امن پسند ملکوں کے لیے عام ہے۔ جب کوئی ملک اقوام متحده کی رکنیت اختیار کرتا ہے تو وہ اقوام متحده کے چار ٹر میں درج مقاصد و قوانین کو قبول کرتا ہے، اس لیے جب بھی کوئی ملک اقوام متحده کا ممبر بنے گا، وہ پہلے اس چار ٹر کو قبول کرے گا۔ یہ چار ٹر اقوام متحده کا دستور اعمال ہے جس سے عالمی امن کے لیے رکن ملکوں کی امیدوں کا اظہار ہوتا ہے اور اس مقصد کے حصول کی خاطر کام کرنے میں یہ راہ نما حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت (جس وقت یہ تعارف لکھا گیا) کل ملکوں کی تعداد ۸۹ تھی۔ اب اقوام متحده کے رکن ملکوں کی تعداد ۱۹۰ سے بڑھ چکی ہے اور کوسوو کے شامل ہونے سے مسلم ممالک کی تعداد ۹۵ ہو جائے گی۔ یہ تقریباً تیسرا حصہ بنتے ہیں۔

اقوام متحده کے اس چار ٹر کی تہمید میں لکھا ہے کہ

”چونکہ ہر انسان کی ذاتی عزت اور حرمت اور انسانوں کے مساوی اور ناقابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا اس دنیا میں آزادی، انصاف اور امن کی بنیاد ہے،

چونکہ انسانی حقوق سے لاپرواٹی اور ان کی بے حرمتی اکثر ایسے وحشیانہ انعال کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے جس سے انسانیت کے ضمیر کو خستہ صدمے پہنچے ہیں، عام انسانوں کی بلند ترین آرزو یہ رہی ہے کہ ایسی دنیا و جوہ میں آئے جس میں تمام انسانوں کو اپنی بات کہنے اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو اور خوف اور احتیاج سے محفوظ ہو، چونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عمل داری کے ذریعے محفوظ رکھا جائے، اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ انسان عاجز آ کر جبرا اور استبداد کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہو جائے،

چونکہ یہ ضروری ہے کہ قوموں کے درمیان ووستانہ تعلقات کو بڑھایا جائے، چونکہ اقوام متحده کی ممبر قوموں نے اپنے چارٹر میں بنیادی انسانی حقوق، انسانی شخصیت کی حرمت اور قدر اور مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عقیدے کی دوبارہ تصدیق کر دی ہے اور وسیع تر آزادی کی فضائیں معاشرتی ترقی کو تقویت دینے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کا ارادہ کر لیا ہے،

چونکہ ممبر ملکوں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ اقوام متحده کے اشتراک عمل سے ساری دنیا میں اصول اور عمل انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا زیادہ احترام کریں گے اور کروائیں گے، چونکہ اس عہد کی تکمیل کے لیے بہت ہی اہم ہے کہ ان حقوق اور آزادیوں کی نوعیت کو سب سمجھ سکیں،

لہذا جز اس بیان کرتی ہے کہ انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا مشترک معیار ہو گا تاکہ ہر فرد اور ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ان حقوق اور آزادیوں کا احترام پیدا کرے اور انہیں قومی اور بین الاقوامی کاروائیوں کے ذریعے ممبر ملکوں میں اور ان قوموں میں جو ممبر ملکوں کے ماتحت ہوں، منوانے کی بتدربنج کوشش کر سکے۔“

یہ حیثیت ہے اقوام متحده کے چارٹر کی۔ دو باتیں آپ یہاں پھر ذہن میں نہ لے آئیں۔ پہلی یہ کہ کسی بھی ملک کو اقوام متحده کا ممبر بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس چارٹر کو قبول کرے۔ دوسرا یہ کہ اس چارٹر کی حیثیت ایک ایسے بین الاقوامی معاهدے کی ہے جس پر عمل ہر ملک کے لیے

ضروری ہے۔ اس میں تعلیم و تبلیغ بھی ہوگی اور قومی و بین الاقوامی کارروائیاں بھی ہوں گی۔ گویا عملہ اس منشور کو اس وقت دنیا میں بین الاقوامی دستور کی حیثیت حاصل ہے۔

ایک بات میں درمیان میں عرض کرتا چلوں۔ ہمارے ہاں ایک فکری اور قانونی الجھن پائی جاتی ہے۔ پاکستان کے دستور میں ہم نے قرارداد مقاصد بھی منظور کی کہ ہم حاکم اعلیٰ اللہ کو تسلیم کرتے ہیں، عوام کے منتخب نمائندے قرآن و سنت کے پابند ہو کر حکومت کریں گے۔ دستور میں ہم نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کا ریاستی مذہب اسلام ہے اور پارلیمنٹ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بناسکتی اور یہ بھی کہ پارلیمنٹ پابند ہے کہ تمام موجودہ قوانین کو اسلامی شکل دے۔ آپ کے خیال میں دستور میں یہ ساری باتیں ہونے کے باوجود ان پر عمل کیوں نہیں ہوتا؟ دستوری زبان میں قرآن و سنت کی بالادستی اور نفاذ کی جتنی بات ہم کر سکتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ پاکستان کے دستور میں موجود ہے، لیکن اس پر عمل نہیں ہو پا رہا۔ وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ ہمارے دستور میں تضاد ہے۔ دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی کی گارنٹی بھی موجود ہے، لیکن اس کے ساتھ دستور میں انسانی حقوق کے چارڑی کی گارنٹی بھی موجود ہے۔ چنانچہ یہ دو گارنٹیاں آپس میں مکراتی ہیں۔ ہمارے ہاں سانچھ سال سے جو کھیل کھیلا جا رہا ہے، وہ انہی دو گارنٹیوں پر کھیلا جا رہا ہے۔ جب کوئی اسلامی ذہن کا آدمی آتا ہے تو اسلام والی گارنٹی سے فائدہ اٹھاتا ہے جیسا کہ ضیاء الحق نے اٹھایا کہ قرارداد مقاصد دستور میں شامل کر دی، شرعی عدالت قائم کر دی، حدود آزادی نسیں جاری کر دیے، وغیرہ۔ اور اگر کوئی غیر اسلامی ذہن کا آدمی آتا ہے تو انسانی حقوق کی گارنٹی سے فائدہ اٹھاتا ہے جیسا کہ پرویز مشرف نے کیا۔ تو یہ ایک مستقل کشمکش ہمارے ملک میں چل رہی ہے اور ہم لوگ چکی کے دو پاؤں میں پس رہے ہیں۔ یہ ہے اصل لڑائی۔ اس لڑائی میں ہمیں مار پڑتی ہے، ہمارے خلاف پر اپیگنڈا ہوتا ہے، ہمیں وحشی کہا جاتا ہے، درندگی والا کہا جاتا ہے، غیر انسانی کہا جاتا ہے، دہشت گرد بھی کہا جاتا ہے، اور بھی نہ جانے کون کون سے الزامات ہم پر لگائے جاتے ہیں۔ ان سب کی بنیاد دراصل یہی ہے۔

## انسانی حقوق کا علمی منشور اور اسلامی تعلیمات

یہ تو تھا اقوام متحده کے انسانی حقوق کے چارٹر کا پس منظر۔ اب ہم اس چارٹر کی چند دفعات کا شق وار جائزہ لیتے ہیں۔ اس میں دو باتیں زیر بحث آئیں گی۔ ایک تو یہ کہ اس چارٹر کے حوالے سے میں الاقوامی حلقوں کے ہمارے قوانین پر کیا اعتراضات ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس چارٹر کے حوالے سے شرعی نقطہ نظر سے ہمارے تحفظات کیا ہیں۔

### انسان کی عزت و تکریم

دفعہ نمبرا:

”تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں ضمیر اور عقل و دلیعت ہوئی ہے، اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔“

تبصرہ:

اصولًا اس شق پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ انسانی مساوات کی تعلیم اسلام نے بھی دی ہے۔ حضرت عمر کے زمانے میں ایک گورنر نے کسی کو بلا وجہ مارا تو اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے کہا تھا کہ مذ کم تعبد تم الناس ولقد ولدتهم امهاتهم أحرا را! (ابن عبد الحکم، فتوح مصر، ص ۱۹۰) تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا ہے؟ ان کی ماوں نے تو ان کو آزاد جانا تھا۔

البتہ اس دفعہ کی تطبیق کے لحاظ سے ہمارا ایک تحفظ ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ عزت و تکریم کے لحاظ

سے سب انسان برابر پیدا ہوئے ہیں، لیکن جب یہ تطبیق کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ عزت نفس کے انتبار سے بھی سب انسان برابر ہیں۔ اس میں ہمیں تھوڑا سا کلام ہے۔ ہم جب بات کرتے ہیں تو ہم دو مرحلوں میں بات کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے: *لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ، ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ* (اتہم ۹۵: ۳، ۵)۔ ایک اور مقام پر ہے: *وَلَقَدْ كَرَمْنَا بَنِي آدَمَ* (بُنی اسرائیل ۷: ۱۰)۔ پھر ایک اور مقام پر ہے: *أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ* (الاعراف ۷: ۱۷)۔ ہم کہتے ہیں کہ سب انسان برابر پیدا ہوئے ہیں، لیکن موت تک سب برابر نہیں ہیں۔ *إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتُقَاتُكُمْ* (المجرات ۴۹: ۱۲) ہمارے ہاں تکریم کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ مجرم اور غیر مجرم کی تکریم برابر نہیں ہے۔ یہ ہمارے اصولوں میں ہے۔ مجرم قتل کا ہو، زنا کا ہو، کسی معاشرتی جرم کا مجرم ہو، وہ بے گناہ شخص کی طرح تکریم کا مستحق نہیں ہے، جبکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بے گناہ شخص کی طرح ہی تکریم کا مستحق ہے۔ اس لیے یہ لوگ کہتے ہیں کہ مجرم کو ایسی سزا نہیں دی جائے گی جس سے اس کی تذلیل ہوتی ہو۔ یہ کہتے ہیں کہ انسان مجرم ہو یا غیر مجرم، تکریم میں سب برابر ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر مجرم اور غیر مجرم تکریم میں برابر ہوں گے تو جرم کو کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ تو پہلی شق میں یہ ہمارا جزوی تحفظ ہے۔ لا فضل لعربي على عجمى ولا لا حمر على اسود الا بالتفوى۔ (مسند احمد، رقم ۲۲۳۹۱) یعنی ہم کردار کی بنیاد پر ایک آدمی اور دوسرے آدمی کی عزت میں فرق کرتے ہیں۔ اصولاً ہمیں اس چاروں کی پہلی شق سے اتفاق ہے لیکن اس کی بنیاد پر جو آگے تطبیقات ہوتی ہیں، ان میں ہمارا ایک تحفظ ہے کہ ہم مجرم و غیر مجرم کے لیے یہساں تکریم نہیں مانتے۔

## آزادی ہر شخص کا حق ہے

دفعہ نمبر ۲:

”ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قوم، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“

تبصرہ:

اصول آیہ بھی تھیک ہے کہ تمام حقوق سب کے لیے برابر ہیں۔ کوئی کالا ہے، کوئی گورا ہے، امریکی ہے، افریقی ہے، تمام حقوق میں سب برابر ہیں۔ اس کے علاوہ جس علاقے یا ملک سے کوئی شخص تعلق رکھتا ہے، اس کی سیاسی کیفیت، دائرہ اختیار یا میں الاقوامی حیثیت کی بنیاد پر اس سے کوئی امتیازی سلوک نہیں ہو گا۔ کوئی آزاد ملک میں رہتا ہے، کوئی غلام ملک میں رہتا ہے، کوئی اقوام متحده کے زیریتویت ملک میں رہتا ہے، انسان تمام حقوق میں برابر ہوں گے۔

## جان کی آزادی اور تحفظ

دفعہ نمبر ۳:

”ہر شخص کو اپنی جان، آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔“

تبصرہ:

جیہے الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

ان دماء کم و اموالکم و اعراضکم علیکم حرام، کحرمة یوم مکم  
هذا، فی بلد کم هذا، فی شهر کم هذا (بخاری، رقم ۲۰۵۲، ۶۵۵۱)  
کسی شخص کی جان، مال اور عزت کسی دوسرے کے لیے حلال نہیں ہے۔ بخاری کی ایک روایت  
میں وابشار کم کا لفظ بھی ہے کہ کسی کا چڑا بھی کسی دوسرے کے لیے حلال نہیں ہے۔ اس دفعہ  
سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

## غلامی کا مسئلہ

دفعہ نمبر ۴:

”کوئی شخص غلام یا لوڈی بنا کر نہ رکھا جاسکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی شکل  
بھی ہو، منوع قرار دی جائے گی۔“

## تبصرہ:

اے کہتے ہیں غلامی کا مکمل خاتمہ۔ اسے بڑی تفصیل کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ ہم نے غلامی کا خاتمہ کیا ہے اور آپ لوگ غلامی کے خاتمہ پر ہم سے اتفاق بھی کرتے ہیں، لیکن آپ پھر بھی اپنے اداروں میں غلامی پڑھار ہے ہیں۔ وہ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے قوانین میں غلامی ختم نہیں کی۔ قرآن میں بھی غلامی پڑھار ہے ہیں:

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكُتُ أَيْمَانُكُمْ (النساء: ۲۲) (المومنون: ۲۳)

ہے: إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أُوْ مَا مَلَكُتُ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ (المومنون: ۲۴)

(۱) قرآن کریم میں بھی ہم غلامی کے مسائل پڑھاتے ہیں اور احادیث میں اور فقہ میں بھی مکاتبہ، تدبیر، استغیلا وغیرہ کے مسائل پڑھاتے ہیں۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ ہم غلامی کے عملاً خاتمے میں تو ان کے ساتھ ہیں، لیکن ذہناً غلامی کے خاتمے سے متفق نہیں ہیں۔ یہ بات درست بھی ہے کہ ہم نے عملاً غلامی کا خاتمہ قبول کر لیا ہے۔ گزشتہ ایک سو سال کے دوران جہاد کے عنوان سے جتنی جنگیں ہوئی ہیں، کیا کسی جنگ میں مسلمانوں نے کسی کو غلام یا لوٹی بنا�ا ہے؟ کشمیر، فلسطین، افغانستان اور دیگر ممالک میں مسلمانوں نے کسی کو لوٹی یا غلام نہیں بنایا۔

ہمارے دینی مدارس کے نصاب پر ان کے جو اعتراضات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ مخالف کی بات سمجھنا بہت ضروری ہے اور میں آپ حضرات کے سامنے ان کے موقف کی وضاحت کر رہا ہوں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ہم سے متفق بھی ہیں اور عملاً آپ ایسا کر بھی نہیں رہے تو پھر آپ اپنے مدارس میں یہ پڑھا کیوں رہے ہیں؟ ان کا ہم سے مطالبہ ہے کہ ہم اپنے ان قوانین میں ترمیم کریں۔ غلامی سے متعلقہ آیات قرآن سے نکالیں۔ غلامی سے متعلقہ احادیث کے ابواب کتابوں سے نکالیں۔ فقہ کی کتابوں سے غلامی کی بحشیں نکال دیں۔ اگر آپ لوگ نکال نہیں سکتے تو کم از کم ان کو پڑھانا تو چھوڑ دیں۔

میں ان سے کہتا ہوں کہ بھی یہ تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ نہ قرآن کریم کے کسی قانون

میں رد و بدل کا ہمیں اختیار ہے اور نہ صحیح احادیث میں سے کسی کا انکار ہمارے اختیار میں ہے۔ ایک صاحب مجھ سے بات کرنے لگے کہ مولوی صاحب کچھ نہ کچھ کرنا تو پڑے گا، ورنہ ہم میں الاقوامی برادری میں کیسے ایڈ جسٹ ہوں گے؟ میں نے ان صاحب کو سیدھا انکار کرنے کی بجائے یہ مشورہ دیا کہ ٹھیک ہے۔ آپ ایک ایجنسڈ اہنالیں کہ آپ نے قرآن و احادیث میں کہاں کہاں تراجمیں کرنی ہیں، بلکہ میں اقوام متحده کے چارڑ کو سامنے رکھتے ہوئے اس ایجنسڈ کی تیاری میں آپ کی مدد بھی کر دوں گا، لیکن اس ایجنسڈ پر عملدرآمد کے لیے اسے منظور کس اتحارثی سے کروانا ہے؟ یہ کام آپ کا ہے۔ آخر کوئی اتحارثی اسے قبول کر کے منظوری دے گی تو اس پر باقاعدہ عملدرآمد ہو گا۔ جیسے پاکستان کے دستور میں کوئی ترمیم کرنی ہو تو اس کی اتحارثی پارلیمنٹ ہے۔ کسی جماعت کے منشور میں ترمیم کرنی ہو تو اس کی اپنی کوئی دستور ساز کمیٹی ہوتی ہے جس سے اسے منظور کروایا جاتا ہے۔ اسی طرح آپ قرآن و احادیث میں جو تراجمیں طے کریں گے، آخر انہیں منظور کس اتحارثی سے کروائیں گے؟ ہمارے پاس تو اس کی کوئی اتحارثی نہیں ہے۔ نہ دارالعلوم دیوبند کے پاس ہے، نہ دارالعلوم کراچی کے پاس، نہ مدینہ یونیورسٹی کے پاس ہے۔ اس دنیا میں تو کوئی اتحارثی نہیں ہے جو یہ تراجمیں منظور کر کے ان پر عملدرآمد کر سکے۔ اب قرآن کریم میں ترمیم کی درخواست ہم اقوام متحده کو دینے سے تور ہے۔

وہ صاحب بالآخر کہنے لگے کہ جی اتحارثی تو واقعی کوئی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ پھر وقت ضائع کرنے کا فائدہ؟ میں یہاں وہ بات پھر دہرا دیتا ہوں کہ اگر قرآن کریم کے کسی قانون میں رد و بدل کا اختیار ہوتا تو کس کے پاس ہوتا؟ میں لوگان فیہما الہہ کے اسلوب میں مفروضے کے درجے میں بات کر رہا ہوں۔ اللہ نے تو اپنے نبی سے کہا ہے:

وَإِذَا تُلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا يَبْنَاهُ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقاءَ نَارًا أَتَتِ  
بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدْلًا (یونس: ۱۰)

”او جب ان کو ہماری واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات کا اندیشہ نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے کر آؤ یا اس کو تبدیل کر دو۔“

یہ تو تھا ایجندہ، اب آگے فیصلہ ہے۔ فرمایا:

**قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِيْ**

”آپ کہہ دیجیے کہ مجھے تو از خود اس میں تبدیلی کا سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔“

یہ بات اللہ تعالیٰ کس سے کھلوار ہے ہیں؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اب قیامت تک جہاں اور جب بھی اُتِ بِقُرْآنِ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدْلُهُ کا مطالبہ ہو گا، اس کا یہی جواب ہو گا:  
**قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِيْ**۔ قرآن کریم نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور آگے یہ بھی کہہ دیا کہ: **إِنَّ أَتَبْعُ إِلَّا مَا يُوَحَّى إِلَيْيَ**۔ میں تو بس وہی کا پابند ہوں۔ پھر قرآن نے یہاں بھی بس نہیں کی، اس کے بعد یہ بھی کہا ہے کہ: **إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ** عذاب یوم عظیم۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے یہ غلطی کر دی تو قیامت کے روز عذاب میں پکڑا جاؤں گا۔

بہر حال میں ان کے اعتراض پر واپس آتا ہوں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ جب آپ لوگ ہمارے ساتھ اس معاہدے میں شریک ہیں، وہ تنخیل بھی کر رکھے ہیں اور عملًا بھی آپ نے غلامی کا اختتام کر رکھا ہے تو پھر آپ نظری اور علمی طور پر اس کو کیوں باقی رکھے ہوئے ہیں؟ قرآن و حدیث میں آپ یہ کتابت و مکاتبت، استغایا و مدد پیر اور یہ کفارات کے مسئلے اپنے طلبہ کو کیوں پڑھا رہے ہیں؟ اب غلامی کیا ہے اور اس پر ہمارا موقف کیا ہے؟ اس پر بات کرنے سے ان حضرات کے اعتراض کا جواب سامنے آجائے گا۔

جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس زمانے میں کسی شخص کو غلام بنانے کے تین طریقے رائج تھے۔ ایک طریقہ تو وہ تھا جسے آج کل بردہ فروشی کہتے ہیں۔ کوئی طاقتو ر آدمی کسی کمزور آدمی کو پکڑتا تھا اور غلام بنا کر نیچ دیتا تھا۔ زید بن حارث بھی ایسے ہی غلام بنے تھے۔ وہ کسی غلام خاندان کے فرد نہیں تھے۔ راہ چلتے کچھ طاقتو ر لوگوں نے انھیں پکڑا اور نیچ دیا۔ سلمان فارسی بھی ایسے ہی غلام بنے تھے۔ علم کی تلاش میں سفر کر رہے تھے، کچھ طاقتو ر لوگوں کے ہتھے چڑھ

گئے جنہوں نے غلام بنانے کا نہیں بیٹھا۔ اسے آج کی اصطلاح میں بردہ فروشی کہتے ہیں۔ آج بھی کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ کسی بچے، کسی بچی کو انعام کیا اور آگے بیٹھ دیا۔ چنانچہ ایک طریقہ غلام بنانے کا یہ راستہ تھا۔

دوسری طریقہ غلام بننے اور بنانے کا یہ تھا، جس کا باسل میں بھی ذکر ہے اور پرانی قوموں میں بھی یہ طریقہ رائج رہا ہے، کہ کسی آدمی نے کوئی جرم کیا ہے یا اس کے ذمے کوئی تاویں ہے تو عدالت نے، پنچایت نے، تحریک نے، قضائی اس شخص کو سزا کے طور پر غلام بنادیا، بلکہ بعض اوقات تو مجبور آدمی خود اپنے آپ کو کسی کی غلامی میں دے دیتا تھا۔ مثلاً کسی پر کسی کا کوئی قرض ہے جسے وہ چکانہیں سکتا تو وہ آخر ہار مان کر کہہ دیتا تھا کہ ٹھیک ہے، میں تمہارا غلام ہوں۔ مجھے بیٹھ کر اپنا قرضہ پورا کرو یا خود مجھ سے کام لے لو۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ جنگی قیدی جو ہاتھ میں آتے تھے، انہیں غلام بنالیا جاتا تھا۔ جنگ کے دوران جو لوگ قید میں آ جاتے تھے، ان کے بارے میں مختلف آپشنز ہوتے تھے۔ مثلاً یہ کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا کبھی سبھار کسی حکمت کے تحت ویسے ہی چھوڑ دیا جائے یا قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ ایک صورت یہ ہوتی تھی کہ انہیں قید کر لیا جائے۔ اب جب قید کر لیا جاتا تو پھر دو صورتیں ہوتیں۔ یا تو انہیں قید خانے میں ڈال دیا جائے اور یا انہیں غلام بنانے کے مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یعنی جیل کا قیدی یا پھر گھر کا قیدی۔ حضورؐ کے زمانے میں عرب میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوا کرتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو قید میں رکھنا مشکل تھا۔ چنانچہ یہ قیدی خادم کے طور پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے۔

یہ تین طریقے اس وقت غلام بنانے کے رائج تھے۔ ان میں سے دو صورتیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل طور پر بیٹھ فرمادیں۔ آپ نے بردہ فروشی کو حرام قرار دے دیا اور حرمانے یا تاویں میں بھی کسی کو غلام بنانے کو حرام قرار دے دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین آدمیوں کے خلاف میں قیامت کے دن خود مدعی بنوں گا۔ ان میں سے ایک شخص وہ ہے جو کسی آزاد شخص کو بیٹھ کر اس کی قیمت کھا جائے؛ ورجل باع حرفا فاکل ثمنہ۔ (بخاری، رقم ۲۱۱۲)

## امریکہ میں غلاموں کی منڈیاں

یہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے غلامی کو ختم کر دیا، ان کے ہاں تو ابھی ایک سو سال پہلے تک غلامی رائج رہی ہے۔ امریکہ میں، جو آج دنیا کا بڑا چودھری ہے، افریقہ سے بھری جہاز بھر بھر کر انسانوں کو لا یا جاتا تھا اور امریکہ کی منڈیوں میں لا کر بیچ دیا جاتا تھا۔ آج سے سو سال پہلے تک امریکہ میں غلاموں کی منڈیاں موجود تھیں۔ آزاد آدمی پکڑ کر لائے جاتے تھے اور منڈیوں میں بیچ دیے جاتے تھے۔ امریکہ میں گزشته صدی تک غلامی کے جواز عدم جواز کی بحث چلتی رہی ہے۔ گزشته صدی میں امریکہ میں جو شمال و جنوب کی جنگ ہوئی ہے، میں نے اٹلانٹا کا وہ میدان دیکھا ہے جہاں آخری جنگ ہوئی اور جزل رابرٹ ایڈورڈ لی (Robert E. Lee) نے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس جنگ کے دور میں امریکہ کے دانشوروں نے کتابوں کی کتابیں لکھیں جو غلامی کے جواز پر دلائل سے بھری پڑی ہیں۔ یہ ابھی گزشته صدی کی بات ہے اور آج امریکہ آزادی کا ٹھیکیدار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

امریکہ میں رہنے والے افریقی نسل کے لوگوں کو ۱۹۶۳ء تک دوٹ کا حق حاصل نہیں تھا۔ کونڈو لیزارائس امریکہ کی وزیر خارجہ رہی ہے۔ امریکہ میں وزیر خارجہ کو تقریباً وزیر اعظم کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ صدر کے بعد دوسری بڑی شخصیت وزیر خارجہ کی ہوتی ہے۔ یہ کونڈو لیزارائس صرف سیاست و ان نہیں بلکہ یہ مغرب کے چند بڑے داش وروں میں سے ایک ہے۔ میں نے اس کا شہر بھی دیکھا ہے اور اس کا گھر بھی دیکھا ہوا ہے۔ اس عورت کا باپ ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے دوٹ کا حق لینے کے لیے امریکہ میں عدالتی جنگ لڑی۔ اس کے باپ کو دوٹ کا حق حاصل نہیں تھا، اس لیے کوہ افریقی نسل کا لالا تھا۔ اس نے ایک طویل عدالتی جنگ لڑی کہ ہم لوگ بھی امریکہ کے شہری ہیں، ہمیں دوٹ کا حق کیوں حاصل نہیں ہے! میں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ اس بات کو ابھی آدھی صدی بھی نہیں گزری اور یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے غلامی ختم کی ہے، جبکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ غلامی سب سے پہلے اسلام نے ختم کی ہے۔ برداشت فروشی اور بطور تاوان کے غلام بنانے کو اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے ختم کر دیا تھا اور غلامی کی صرف تیری صورت باقی رہ گئی تھی۔

## غلامی کے بارے میں ہمارا موقف

یہاں پر سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا اسلام نے غلام بنانے کا حکم دیا ہے یا غلامی کی جو تین صورتیں راجح تھیں، ان میں سے دو کو ختم کر کے ایک صورت کو بطور آپشن کے باقی رکھنے کی اجازت دی ہے؟ یعنی جنگی قیدی اگر آپ کے ہاتھ میں آ گیا ہے تو کیا اسے غلام بنانا ضروری ہے یا آپ کی مرضی ہے کہ اس سے کس طرح سے فائدہ اٹھائیں؟ مزائے موت دے دیں، اپنے کسی قیدی کے ساتھ تبادلہ کر لیں، فدیے لے کر چھوڑ دیں، ویسے ہی رضا کارانہ چھوڑ دیں، قید خانے میں ڈال دیں یا اس سے ایسا کام لے لیں جو اس کے بس سے باہر کانہ ہو۔ سورہ محمد میں اللہ تعالیٰ نے اس حوالے سے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ:

فَإِمَّا مَنَا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أُوْزَارَهَا (مودع: ۳۷)

”پھر یا اس کے بعد یا تو احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیے لے کر، یہاں تک کہ جنگ کا زور بالکل

ٹوٹ جائے۔“

گویا اسلام میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانا فرائض، واجبات یا مستحبات میں سے نہیں ہے۔ یہ تو مباحثات میں سے ہے اور ایسا کوئی بین الاقوامی معاهدہ قبول کرنا جس سے کسی مباح پر اثر پڑے تو اس کے لیے اس مباح کو چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ہم نے ایسا ہی کیا ہے۔ ہم نے غلامی کی ایک صورت کو اس زمانے کے عرف کے حوالے سے قبول کیا تھا اور آج کے عرف کے حوالے سے اس ایک صورت سے بھی ہم نے عملہ دستبرداری اختیار کر لی ہے۔ البتہ ایک بات سمجھنے کی ہے۔ ایسا ہم نے اصولاً نہیں بلکہ عملہ کیا ہے۔ خدا نخواستہ غلامی کے ایسے حالات دنیا میں پھر پیدا ہو جائیں تو ہم ان حالات سے نہیں کارستہ کیوں بند کریں؟ اصولاً ہم اپنے موقف پر قائم ہیں۔ قرآن و سنت کی تعلیمات اصولاً اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ہم احکام سے دستبردار نہیں ہوئے بلکہ تطبیق سے دستبردار ہوئے ہیں۔

ایک مزید بات سمجھنے کی ہے۔ میرا مغرب سے سوال ہے کہ تم اپنے عرف کو دائیٰ اور حصتی عرف کیسے کہہ دیتے ہو؟ آیا عرف بھی دائیٰ رہا ہے؟ تعامل بھی ابدی رہا ہے؟ یہ تو بدلتا رہتا ہے۔ ایک

بات میں پھر عرض کرتا چلوں کہ جہاں ہمارے احکامِ صریح، نص قطعی اور نص صریح متاثر نہ ہوتے ہوں، وہاں ہم بین الاقوامی معاہدات کو قبول بھی کرتے ہیں اور ان کا احترام بھی کرتے ہیں۔ ہاں، جہاں ہمارے احکامِ منصوصہ متاثر ہوں گے، وہاں ہمیں ضرور اعتراض ہو گا۔ ہم تو آج خود مطالبه کرتے ہیں کہ گوانٹانامو جزیرے کے قیدیوں سے بین الاقوامی معاہدات اور جنیوا کنوشن کے مطابق سلوک کیا جائے۔

اب اس امکان کی نفی تو نہیں کی جاسکتی کہ کبھی ایسا دور پھر واپس آجائے جس کی یہ لوگ ہمیں دھمکیاں بھی دیتے ہیں کہ ہم تمہیں پھر کے دور میں واپس بھیج دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ پھر کا دور پھر واپس آجائے۔ امکانات کو یہ لوگ خود تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر دنیا میں ایسا دور، ایسے حالات دوبارہ آجائیں کہ غلامی کی یہ صورت رانج ہو جائے تو ایسی صورت حال سے نہیں کے لیے ہمارے پاس احکامات موجود ہیں، ان احکامات سے ہم دستبردار نہیں ہوئے، وہ اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ چنانچہ میرا مغرب کے دانشوروں سے ایک سادہ سماں سوال ہے۔ فرض کریں، ہم پھر کے دور میں واپس چلے گئے ہیں اور کسی جنگ میں کچھ قیدی ہمارے ہاتھ آگئے ہیں۔ ان قیدیوں کو ہم اپنی سیاسی اور جنگی حکمت عملی کے تحت نہ آزاد کر سکتے ہیں، نہ کسی قسم کے تبادلے میں چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ہم انھیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اب ہمارے پاس دو صورتیں ہیں۔ یا تو انہیں اجتماعی طور پر کسی قید خانے میں ڈال دیا جائے اور یا پھر انہیں مختلف خاندانوں کے حوالے کر دیا جائے۔

یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس قیدی کے لیے ان میں سے بہتر صورت کون سی ہے؟ قید کی کوئی مدت بھی معین نہیں ہے۔ آپ اس قیدی سے پوچھیں کہ وہ جیل میں رہنا چاہتا ہے یا کسی کے ساتھ گھر میں؟ مکمل غلامی چاہتا ہے یا نیم آزادی؟ قیدی سے پوچھیں کہ وہ حقوق کے تعین کے ساتھ کسی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے یا پھر بس جیل میں پڑا گلنا سڑنا چاہتا ہے؟ آج کل کی جیلیں آپ دیکھ لیں۔ ایک قیدی ایک بھی قید گزار رہا ہے۔ جب وہ اپنی قید کا ایک بڑا عرصہ گزار لیتا ہے تو اسے ضمانت پر کسی زمیندار کے پاس یا کسی رفاقتی ادارے کی خدمت کے لیے بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ

اپنی قید کا باقی عرصہ گزارتا ہے۔ آپ اس قیدی سے پوچھیے کہ اس کے لیے وہ جیل کی چار دیواری بہتر تھی یا نیم آزادی کے ساتھ خدمت بہتر ہے؟ ایک عورت کے لیے جیل میں سڑنا بہتر ہے یا حقوق کے تعین کے ساتھ کسی کے ساتھ رہنا بہتر ہے؟

میں عرض کر رہا تھا کہ اسلام نے غلامی کی تین قسموں میں سے ایک قسم کی اجازت دی ہے اور اس قسم پر بھی عمل کی نوبت بہت سے آپشنز کے بعد آتی ہے کہ جب ایک جنگی قیدی کو فدیہ لے کر نہ چھوڑنا ہو، قیدی کے تباولے میں رہانہ کرنا ہو، سزا نے موت نہ دینی ہو تو ایسی صورت میں اسے قید میں ڈال کر اس کی زندگی کو بالکل ہی بے مقصد بنانے کے بجائے اسے حقوق کے تعین کے ساتھ کسی کے ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی جائے۔ میں پورے شرح صدر کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ ایسی صورت میں قیدی کا بہترین مفاد اسی میں ہے کہ اسے جیل میں ڈالنے کی بجائے کسی کا غلام بنادیا جائے جہاں اسے زندگی کے کچھ نہ کچھ حقوق میسر ہوں۔ اب یہ بات اس کے بعد کی ہے کہ اسلام نے اس غلام کے ساتھ حسن سلوک پر کس طرح ابھارا ہے اور اس سے بدسلوکی پر کیسی مذمت کی ہے۔ اہل مغرب کا اعتراض یہ ہے کہ اگر آپ لوگ غلامی کے خاتمے پر عملاً متفق ہیں تو پھر آپ لوگ اپنے نصاب میں غلامی پڑھاتے کیوں ہیں، غلامی کا ذکر کیوں کرتے ہیں اور غلامی سے متعلق قرآن و سنت کے احکام کو منسوخ کیوں نہیں کرتے؟ چارڑی کی شق اس طرح سے ہے کہ ”کوئی شخص غلام یا یاونڈی بنانے رکھا جاسکے گا۔ غلامی اور برداہ فروشی چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو، منوع قرار دے دی جائے گی۔“ اس کے جواب میں، میں نے جو عرض کیا، اس کا خلاصہ عرض کر دیتا ہوں کہ غلامی کی تین میں سے دو صورتیں تو ہم نے آپ لوگوں سے بارہ سو سال پہلے ختم کر دی تھیں۔ ہمارے ختم کرنے کے بعد بھی آپ لوگ بارہ سو سال تک برداہ فروشی کرتے رہے ہیں۔ تاداں اور سزا میں غلام بنانے کو بھی اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے ختم کر دیا تھا۔ تاہم تیسرا قسم یعنی جنگی قیدیوں کو بطور غلام رکھنے کا اسلام نے حکم نہیں دیا، بلکہ ایک آپشن کے طور پر اس صورت کو باقی رکھنے کی اجازت دی ہے اور ہم اپنے قوانین کی روشنی میں قیدی کے لیے، ایسے حالات میں جب اسے چھوڑنا تو میں نہ ہو، دوسرے آپشن یعنی جیل میں ڈال دینے سے بہتر سمجھتے ہیں۔

اس وقت غلامی کے حوالے سے جو عالمی عرف ہے، ہم نے اسے مکمل طور پر قبول کر لیا ہے۔ ہم تو کسی جنگ میں بھی کوئی غلام نہیں بنارہے، بلکہ ایک لطیفے کی بات ذکر کرتا چلوں۔ روای استعمار کے خلاف جہاد افغانستان کے دوران میں مجھے ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ کو جہاد سے کوئی لوغڑی ملی ہے؟ میں نے کہا نہیں بھئی، ہم یعنی الاقوامی معاہدے کے پابند ہیں، اس لیے کہ غلام اور لوغڑی بنانا اسلام میں فرائض میں سے نہیں ہے، بلکہ مباحثات میں سے ہے اور خاص حالات میں صرف ایک اجازت کی حد تک ہے۔ یہاں پھر یہ بات واضح کرتا چلوں کہ قرآن و احادیث کے منصوصات کو تبدیل کرنے کی اتھارٹی نہ ہم خود رکھتے ہیں اور نہ کسی اور کی مانتے ہیں۔

## اسلام میں جرم و سزا کے قوانین

دفعہ نمبر ۵:

”کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوزیاً ذلیل سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔“

تبصرہ:

اس دفعہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی شخص کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کریں گے جس میں جسمانی اذیت ہو یا تذلیل ہو اور کسی شخص کو ایسی سزا نہیں دی جائے گی جس میں جسمانی تشدد ہو اور اس کی تذلیل ہو۔

آئیے، اس دفعہ کے مضرات پر غور کریں۔

اسلام میں سزاوں کا نظام تین حصوں میں ہے: قصاص، حدود اور تعزیرات۔

قصاص کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالأنفَ بِالأنفِ وَالْأُذْنَ بِالْأُذْنِ  
وَالسُّنَّ بِالسُّنَّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ (المائدہ ۵: ۲۵)

اس میں جسمانی تشدد بھی ہے اور تذلیل بھی ہے۔

حدود کی سزاوں میں رجم کی سزا ہے۔ اب رجم تو نام ہی تشدد کا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کا شنے کی

سزاوں میں بھی تشدد ہے۔ تعزیرات میں کوڑے مارنے کی سزا میں ہیں۔ ان میں بھی تشدد ہے۔ اور پھر وَلَيَشَهُدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (النور: ۲۲) کا حکم بھی ہے۔ اب برس عام سزادینے میں تذلیل بھی ہے۔ یعنی اسلامی سزاوں کا کوئی شعبہ ایسا نہیں پچا جو اقوام متحده کے چارٹر کی زد میں نہ آتا ہو۔ اخبارات میں یہ جملے تو اکثر آپ حضرات پڑھتے ہوں گے کہ یہ غیر انسانی، ظالمانہ اور وحشیانہ سزا میں ہیں۔ ان جملوں کے پیچھے دراصل یہ دفعہ بول رہی ہوتی ہے۔ اب تو پاکستان سے یہ مطالبه ہوتا ہے کہ قصاص میں قتل کی سزا بھی ختم کی جائے۔ حال ہی میں اقوام متحده کی جزل اسیبلی میں ایک قرارداد منظور ہوئی ہے کہ موت کی سزا کسی بھی جسم میں نہ دی جائے۔ ہمارے ہاں موت کی سزا قصاص، ارتداو، محاربہ، قطع طریق اور بغاوت وغیرہ میں دی جاتی ہے۔ جزل اسیبلی نے بھاری اکثریت سے یہ قرارداد منظور کی ہے کہ سزا نے موت کا قانون پوری دنیا سے ختم ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لیے پوری دنیا میں ایک ہم چل رہی ہے۔ ظاہر ہے پاکستان بھی دنیا سے باہر نہیں ہے، ہم سے بھی یہ مطالبة ہے کہ سزا نے موت ختم کر دی جائے۔ دیگر قوانین تو آہستہ آہستہ ختم ہو رہی رہے ہیں، جیسا کہ کوڑوں کی سزا میں ختم کر کے پانچ سال قید کی سزا رکھ دی گئی ہے، اس لیے کہ دنیا والے کہتے ہیں کہ آپ اتنے معزز اور مکرم آدمی کو سر عالم کوڑے کیوں مارتے ہیں؟ اب اس دفعہ کا یہ چھوٹا سا جملہ آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ اس میں انہوں نے اسلام کے سزاوں کے سارے نظام کو لپیٹ دیا ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان کی باتوں کو سمجھ بھی نہیں پاتے اور وہ اپنا سارا کام کر گزرتے ہیں۔

میں عرض کر رہا تھا کہ یہ جو آپ کی قصاص، حدود اور تعزیرات وغیرہ کی سزاوں کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جاتا ہے اور انہیں غیر انسانی اور وحشیانہ قرار دیا جاتا ہے، یہ اقوام متحده کے چارٹر کی اس دفعہ نمبر ۵ کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے مطالبه یہ ہوتا ہے کہ جب آپ نے بین الاقوامی معاهدے پر دخنخ طکر رکھے ہیں کہ ہم کسی شخص کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کریں گے اور کسی شخص کو ایسی سزا نہیں دیں گے تو پھر آپ ایسی سزا میں کیوں نافذ کرتے ہیں جن میں ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹے جاتے ہیں، کوڑے لگائے جاتے ہیں اور سب کے سامنے مجرم کی تذلیل کی جاتی ہے؟

## اسلام اور بین الاقوامی عرف

ہمارے ہاں سپریم کورٹ میں ایک بحث چلی تھی۔ چکوال کا ایک ڈکیتی کا مقدمہ تھا۔ ایک آدمی نے قتل بھی کیا تھا اور ڈاکہ بھی ڈالا تھا۔ چکوال کی ایک خصوصی عدالت نے اس کیس میں فیصلہ سنایا کہ اس آدمی کو برسر عام پھانسی دی جائے گی۔ اس فیصلے کا سپریم کورٹ نے از خود نوش لے لیا۔ سپریم کورٹ میں یہ بات زیر بحث آگئی کہ کسی مجرم کو برسر عام سزا دینے میں تذلیل پائی جاتی ہے۔ تذلیل عزت نفس کے منافی ہے اور عزت نفس انسانی حقوق میں شامل ہے۔ چاروں صوبوں کے ایڈ ووکیٹ جزل اور وفاقی اثارنی جزل بحث میں شریک ہوئے۔ ایس ایم ظفر ہمارے دوست ہیں، بہت بڑے وکیل ہیں، وہ بھی پیش ہوئے۔ اس بحث میں وکلا کا موقف تھا کہ برسر عام سزا میں نہیں ہونی چاہئیں اور اس موقف کی حمایت میں انہوں نے دو دلیلیں پیش کیں۔ ایک دلیل یہ کہ قرآن میں ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُهُودِ (المائدہ ۱: ۵) یعنی قرآن کریم ہمیں معاهدات کی پابندی کا حکم دیتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم معاملات میں ہمیں عرف کی پابندی کی تلقین کرتا ہے، جبکہ یہ آج کا عالمی عرف ہے، لہذا ہم اس بات کے پابند ہیں کہ ہم اپنے قانونی نظام میں اس بات کی پابندی کریں۔

میں نے پہلے یہ بات واضح کی تھی کہ ہمیں بین الاقوامی معاهدات سے انکار نہیں ہے، لیکن ہمارے ہاں اس کے لیے ایک حد فاصل ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم نصوص صریحہ اور احکام قطعیہ کے حوالے سے نہ عالمی عرف کو مانتے ہیں اور نہ معاهدات کو مانتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر ہر معاملے میں عرف کو بھی مان سکتے ہیں اور معاهدات کو بھی قبول کر سکتے ہیں۔ غلامی کے معاملے میں ہم نے عرف کو قبول کر لیا ہے، کیونکہ وہ منصوصات میں سے نہیں ہے، لیکن قصاص، حدود اور تعزیرات کے معاملے میں ہم عرف کو قبول نہیں کرتے، کیونکہ یہ احکام قطعیہ ہیں اور ان میں ہمارے لیے کوئی عرف یا معاهدہ قبول کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

بہر حال سپریم کورٹ میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ چونکہ قرآن کریم معاهدات کی پابندی کا اور بین الاقوامی عرف کو قبول کرنے کا حکم دیتا ہے، اس لیے ہمارے لیے اپنے قانونی نظام میں ان

باتوں کی پابندی لازم ہے۔ چنانچہ سپریم کورٹ نے یہ آرڈر جاری کیا کہ ہمارے لیے اپنے قانونی نظام میں اقوام متحده کے چارٹر کی اس دفعہ کی پابندی لازم ہے۔ یوں برس عالم سزادی نے کا وہ فیصلہ سپریم کورٹ نے منسوخ کر دیا۔

ہمارے ہاں قانونی نظام میں سب سے زیادہ ~~تکمین~~ سزا موت کی ہے اور یہ سزا صبح سحری کے وقت جیل میں دی جاتی ہے۔ قانون کے مطابق اس سزا کے وقت سپرنٹنڈنٹ جیل، محضیت، ڈاکٹر اور پھانسی کالیور کھینچنے والا جلاد، ان چار آدمیوں کے علاوہ کسی پانچویں آدمی کی موجودگی منوع ہے اور اس کا پس منظر بھی ہے کہ یہ ایک ~~تکمین~~ سزا ہے، اس لیے مجرم کی تذلیل نہیں ہونی چاہیے اور بس وہی لوگ وہاں موجود ہونے چاہئیں جن کی موجودگی با مر مجبوری ضروری ہے۔

آپ نے دیکھا کہ اقوام متحده کے چارٹر کے اس ایک جملے کی زد میں حدود و تعزیرات کے قوانین کا سارا نظام آگیا ہے اور اگر ہم دفعہ نمبر ۵ کو سن و عن قبول کر لیں، عملًا تو ہم نے قبول کیا ہوا ہے، لیکن اگر ہم عقیدے اور اصول کے طور پر بھی اسے قبول کر لیں تو ہمیں اپنے پورے تعزیراتی نظام سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

### اسلام کا خاندانی نظام

اس سے پہلے کہ میں اس حوالے سے اقوام متحده کے منشور کی دفعہ ۱۶ کا ذکر کروں، پہلے آپ خاندانی زندگی سے متعلق اصطلاحات سمجھ لیں۔ قانون کی دنیا میں چند اصطلاحات ہیں، جیسے فوجداری قوانین، دیوانی قوانین اور عائلی قوانین۔ فوجداری قوانین لڑائی جنگزوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایسے قوانین میں حکومت فریق ہوتی ہے، کیونکہ ان معاملات کا تعلق امن عامہ سے ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں حکومت کسی کو بغیر کسی اطلاع یا شکایت کے پکڑ سکتی ہے۔ دیوانی قوانین وہ ہوتے ہیں جن میں آپس کی شکایات پر مقدمات درج ہوتے ہیں۔ ان میں اجتماعی امن عامہ تو زد میں نہیں آتا، لیکن لوگوں کے باہمی معاملات کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ جیسے ایک شخص کو کسی دوسرے شخص سے شکایت ہے کہ اس نے مجھ سے فلاں زیادتی یا ناصافی کی ہے۔ ایسے معاملات میں حکومت کا خود سے کوئی دروس نہیں ہوتا۔ آپ کے ساتھ کسی نے ناصافی یا ظلم کیا ہے تو آپ کو

خود شکایت کرنا ہوگی۔ آپ شکایت نہیں کریں گے تو حکومت آپ کے معاملے میں خود سے کوئی دخل اندازی نہیں کرے گی۔

پبلک لا (Public Law) اور پرنسل لا (Personal Law) کی اصطلاحات بھی ہمارے ہاں استعمال ہوتی ہیں۔ پرنسل لا کہتے ہیں خاندانی نظام کو۔ اس کو القوانین الشخصية، شخصی قوانین، عائی قوانین وغیرہ بھی کہتے ہیں۔ نکاح، طلاق، وراثت، حضانت، کفالت، ولایت، کفاءت وغیرہ سب اسی کے تحت آتے ہیں۔ ہمارے ملک میں عیسائیوں کو ان کے پرنسل لا پر عمل کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح طلاق، حضانت، وراثت اور بچوں کی کفالت وغیرہ کے ان کے اپنے قوانین ہیں اور اس پر عمل کا حق ان کو حاصل ہے۔ قیام پاکستان کے بعد علماء کرام نے جب اسلامی ریاست کے خط و خال واضح کرنے کے لیے ۲۲ دستوری نکات پیش کیے تو ان میں یہ تسلیم کیا کہ ہم اقلیتوں کو ان کے پرنسل لا پر عمل کا حق دیں گے۔ بالکل یہی حق ہم برطانیہ میں مسلمانوں کے لیے مانگ رہے ہیں۔ برطانیہ کے مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کے نکاح، طلاق، وراثت، حضانت، کفالت وغیرہ کے معاملات ان کے اپنے قوانین کے مطابق ٹھے ہوں۔ اب یہاں مغرب کا دوہرा معیار سامنے آتا ہے۔ ہمارے ہاں وہ مطالباً کرتے ہیں کہ اقلیتوں کو ان کے پرنسل لا کے مطابق معاملات ٹھے کرنے کا حق دیا جائے، لیکن جب یہی حق ہم مسلمان ان سے برطانیہ میں مانگتے ہیں تو وہاں وہ ہمیں یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ابھی کچھ عرصہ قبل پروٹستنٹ فرنٹ کے بڑے سربراہ ڈاکٹر رون ولیز نے مسلمانوں کے حق میں کچھ بیانات دیے ہیں جن پر برطانیہ میں کچھ تازع چل رہا ہے۔ انہوں نے ایک یونیورسٹی میں کہا کہ مسلمانوں کو برطانیہ میں مالیات، نکاح و طلاق کے معاملے میں اپنے شرعی قوانین پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے اور حکومت برطانیہ کو چاہیے کہ اپنے عدالتی نظام میں یہ گنجائش پیدا کرے کہ مسلمانوں کو ان کے خاندانی اور مالیاتی معاملات اور تازعات میں ان کے شرعی قوانین کے مطابق ان کے شرعی قاضیوں کے ذریعے فیصلوں کی سہولت حاصل ہو۔ مسلمانوں کے لیے شرعی عدالتیں قائم کرے اور شرعی قوانین نافذ کرے۔ شرعی عدالتیں پاکستان میں قائم ہوں یا نہ ہوں، لیکن عیسائی

فرقے کے سربراہ نے برطانیہ سے مطالبہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے شرعی عدالتیں قائم کی جائیں، شرعی قوانین نفاذ کیے جائیں اور انہیں اپنے قوانین پر عمل کرنے کا حق دیا جائے۔ لیکن صرف دو معاملوں میں: ایک خاندانی قوانین (personal laws) (یعنی نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کے معاملات میں اور دوسرا احوال و حرام کے معاملات میں) اس کے اس مطالبہ پر اس کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا ہے۔ اس سے استغفار کا مطالبہ کیا گیا ہے، لیکن وہ ڈٹا ہوا ہے کہ نہ تو میں بیان واپس لوں گا اور نہ ہی اپنے عہدے سے استغفار دوں گا۔ ڈاکٹر رون ویمز کے اس مطالبہ کے رد عمل میں برطانوی وزیر اعظم گورڈن براؤن کے ترجمان نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا اور ایسا اس لیے نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کے شرعی قوانین انسانی حقوق کے منافی ہیں۔ اس بات کی وضاحت میں ذرا آگے جا کر مناسب وقت میں کروں گا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے اور اس کی یہ بات غلط کیوں ہے۔ بہر حال یہ عیسائی سربراہ اور برطانیہ کے حکومتی حلقوں میں ایک کشمکش چل رہی ہے۔

برطانیہ کے برعکس امریکہ میں مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے اور وہاں چند ایک شہروں میں اکادمک برطانیہ کے برعکس امریکہ میں مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے اور وہی طور پر ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا پا رہے۔ یہودیوں کو بھی اپنے شرعی عدالتیں بھی ہیں، لیکن اجتماعی طور پر ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا پا رہے۔ بہر حال امریکہ کے دستور پر سنل لا پر عمل در آمد کا حق حاصل ہے اور وہ یہ حق استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال امریکہ کے دستور میں یہ سہولت موجود ہے کہ آپ مالیاتی معاملات میں اور شخصی معاملات میں اپنے قوانین پر عمل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ اپنی عدالتیں رجسٹر کرو سکتے ہیں جس کی رو سے آپ کے فیصلے نافذ ہوں گے، جبکہ برطانیہ میں ابھی یہ حق ہمیں حاصل نہیں ہے۔

ہمارے جو اپنے شخصی قوانین اور اصول خابطے ہیں نکاح، طلاق، وراثت، حضانت، کفالت، کفاءت وغیرہ سے متعلق، ان سب پر آج کی دنیا کو اعتراض ہے۔ ان اعتراضات کی وجہ یہ دفعہ نمبر ۱۲ ہے۔ آئیے، اب یہ دفعہ دیکھتے ہیں۔ اس دفعہ کی تین شقیں ہیں:

۵ ”بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت یا نامہب کی بنابر لگائی جائے، شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی اور

نکاح کو نجح کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔“

۵ ”نکاح فریقین کی پوری اور آزاد رضا مندی سے ہو گا۔“

۶ ”خاندان معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے خناخت کا حق دار ہے۔“

تبصرہ:

پہلی بات تو یہ قانون یہ تسلیم کرتا ہے کہ نکاح صرف بالغ مرد اور عورت کا تصور کیا جائے گا۔ صغیر اور صغیرہ کے نکاح کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ملک کے قانون میں بھی نکاح کے لیے بڑی کی کم از کم عمر ۱۶ سال اور بڑی کے کم از کم عمر ۱۸ سال مقرر ہے۔ اگر آپ اس سے کم عمر کے بڑی کے یا بڑی کے نکاح پڑھائیں گے تو قانون اسے جرم تصور کرے گا۔ غالباً قوانین کی رو سے یہ جرم ہے۔ لوگ اس پر زیادہ عمل نہیں کرتے، لیکن قانون میں بہر حال یہ ہے۔ مثلاً اگر کسی مولوی صاحب نے سولہ سال سے کم بڑی یا اٹھارہ سال سے کم بڑی کے کا نکاح پڑھا دیا اور کسی نے اس کی شکایت کر دی تو بڑی کا اور بڑی کے علاوہ مولوی صاحب بھی گرفتار ہو جائیں گے۔ اس جرم کی سزا تین مہینے قید بتائی جاتی ہے۔ نکاح کے علاوہ جو کچھ بھی ہو، اسے قانون درست تسلیم کرتا ہے لیکن نکاح اس سے کم عمر میں نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اگر یہ شق ہم قبول کر لیں تو صغیرہ اور صغیر کے نکاح کے متعلق ان تمام قوانین سے ہم ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں جو ہماری فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

یہ شق دوسری بات یہ کہتی ہے کہ ہر بالغ مرد اور عورت کو آپس میں شادی کا حق حاصل ہے، لیکن بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت یا مذہب کے نام پر لگائی جائے۔ کوئی امریکی آئینہ میلیا کی کسی خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ کوئی چینی کسی رو سے شادی کرنا چاہے تو کوئی پابندی نہیں ہے۔ کوئی کالا کسی گوری سے شادی کرنا چاہے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کوئی مسلمان کسی ہندو یا کسی یہودی سے شادی کرنا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ کوئی سکھ کسی مسلمان سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو کوئی پابندی نہیں۔ مذہب، نسل، قومیت، ان تینوں میں سے کسی کی بنیاد پر بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔

ان تینوں میں سے دو کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نسل یا قومیت کی بنیاد پر نکاح میں ہمارے ہاں

بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ کوئی روئی مسلمان بوسنیا کی کسی مسلمان خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن ہم مذہب کا فرق مانتے ہیں۔ مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی۔ مسلمان مرد کسی غیر کتابی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتا۔ لَا تَنِكُحُوا  
الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوْ اور لَا تُنِكُحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوْ (البقرہ: ۲۲۱) یہ نص قطعی اور نص صریح ہے۔ مسلمان عورت تو کسی غیر مسلم مرد سے کسی صورت شادی کرہی نہیں سکتی، البتہ مسلمان مرد غیر مسلم کتابی سے شادی کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں مذہب کی بنیاد پر نکاح کی جو پابندی ہے، آج کی دنیا کے لیے یا ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ اس پر بڑے تنازعات ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک محترمہ ہیں جو انسانی حقوق کی بہت باتیں کرتی ہیں۔ عاصمہ جہاگیزان کا نام ہے۔ اس خاتون کا خاوند قادیانی ہے۔ خود کو وہ مسلمان کہتی ہے۔ اس کے والد ملک غلام جیلانی مرحوم ہمارے ملک کے معروف لیڈروں میں سے تھے اور مسلمان تھے۔ یہ خاتون کہتی ہے کہ میں خود تو مسلمان ہوں، لیکن میرا خاوند قادیانی ہے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں، لیکن ساتھ یہ بھی کہتی ہے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرا خاوند کافر ہے۔

حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی مغربی پاکستان آسمبلی کے رکن تھے اور ان کے بذلہ سنجی کے واقعات چلتے رہتے تھے۔ مولانا کا اپنا ایک مزاج تھا بات کرنے کا۔ ایک دفعہ آسمبلی میں ایک خاتون کھڑی ہو گئی اور کہا کہ مولوی صاحب! مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے، عورت کو چار شادیوں کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ یہ تو مساوات کے خلاف ہے۔ مولانا نے جواب دیا، بھی آپ چاہیں تو دس شادیاں کریں، آپ کو تو ہم نہیں روک رہے۔ یہ قانون تو مسلمانوں کے لیے ہے۔ اس پر مولانا نے ایک پلک جلسہ میں ایک لطیفہ سنایا۔ کہنے لگے، پرانے زمانے کی بات ہے۔ ایک نواب صاحب تھے۔ انہیں ایک مسئلہ درپیش ہوا تو انہوں نے علماء سے رجوع کیا کہ میں پانچویں شادی کرنا چاہتا ہوں، آپ کوئی جزئیہ تلاش کریں جس سے مجھے اس کی اجازت مل جائے۔ آپ نے کسی بات کی اجازت دینی ہو تو پھر جزئیہ بھی آپ کہیں سے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب نے نواب صاحب سے کہا کہ میں اس کا فتوی دیتا ہوں، تمہارے لیے

پانچویں شادی کی اجازت ہے۔ اس پر شورج گیا کہ فلاں مولوی صاحب نواب صاحب کو پانچویں شادی کی اجازت دے رہے ہیں۔ اس پر باقی علمانے ان مولوی صاحب کو مناظرے کا چینچ کر دیا کہ پانچویں شادی بالکل جائز نہیں ہے۔ ان مولوی صاحب نے بھی چینچ قبول کر لیا۔ نواب صاحب بہت خوش کہ یہ تو بہت تنگڑا مولوی ہے۔ چنانچہ مناظرے کا دربار لگ گیا۔ باقی علماء اور ان کے ساتھی کتابوں کے ذہیر کے ساتھ آگئے جبکہ یہ مولوی صاحب بالکل خالی ہاتھ وہاں پہنچ گئے۔ جب مولوی صاحب سے دلیل مانگی گئی تو انہوں نے اپنے حق میں دلیل دی کہ یہ قرآن میں مَثْنَى وَ ثَلَاثَ وَ رُبَاعَ (النساء: ۲۳) کی پابندی تو مسلمانوں کے لیے ہے۔ آپ حضرات کے خیال میں یہ نواب صاحب پانچویں شادی کی اجازت مانگ کر بھی مسلمان رہیں گے؟ اب جب وہ مسلمان نہیں رہیں گے تو چاہے دس شادیاں کریں۔ نواب صاحب پانی پانی ہو گئے کہ ان مولوی صاحب نے توبیزہ ای غرق کر دیا۔

### شادی میں مذہب کی شرط

بہر حال یہ تو لطینے کی بات تھی۔ یہ سوال ہمارے ہاں اتنا نہیں ہوتا، لیکن یورپ وغیرہ اور خاص طور پر انڈیا میں بہت اٹھایا جاتا ہے۔ یورپ وغیرہ میں تو ایسا ہوتا ہے کہ مسلمان پاکستانی، انڈین، بنگلہ دیشی لڑکیاں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ بیاہ کر کے چلی جاتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کو قانون تحفظ فراہم کرتا ہے۔ ہمارے ہاں الحمد للہابھی تک عدالتیں ایسی شادیاں قبول نہیں کرتیں جن میں لڑکی مسلمان ہوا اور لڑکا غیر مسلم، لیکن یورپ وغیرہ میں بہر حال ایسا نہیں ہے۔ انڈیا میں یہ بہت بڑا مسئلہ بنتا ہے۔ مسلمانوں پر اعتراض ہے کہ باقی سارے مذاہب کے لوگ آپس میں شادیاں کرتے ہیں، تم لوگ الگ کیوں ہو؟ اس بنیاد پر مسلمانوں کو کہا جاتا ہے کہ تم قومی برادری میں ایڈ جست نہیں ہو رہے، نہ رشتہ دیتے ہوا ورنہ لیتے ہو، تم اپنے آپ کو انڈین سوسائٹی سے الگ رکھے ہوئے ہو۔ وہاں یہ معاملہ سپریم کورٹ تک جا چکا ہے اور اس پر آئین میں ترمیم تک کی بات ہو رہی ہے۔ لیکن الحمد للہ وہاں کے مسلمان ڈٹے ہوئے ہیں، بلکہ ہم لوگوں سے زیادہ ڈٹے ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اقوام متحده کے چارٹر کی اس دفعہ نمبر ۱۶ کو ہم اگر عقیدے اور اصول کے طور پر قبول کر لیں تو قرآن و سنت کی نص صریح اور نص قطعی متأثر ہوتی ہے۔

اب پہلی شق کی تیسری بات پر نظرڈالتے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی قائم کرنے اور نکاح کو فتح کرنے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ اگر ہم مسلمان دفعہ نمبر ۱۶ کی اس شق کو قبول کر لیں تو ولایت، خواہ اجباری ہو یا غیر اجباری، ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ولایت بھی ہے اور کفاءت بھی ہے۔ نکاح کرنے میں بالغ لڑکے اور بالغ لڑکی، دونوں کے حقوق برابر ہونے میں ہمارے ہاں فقہا میں اختلاف ہے۔ احتاف کے نزدیک بالغہ پر ولی کی ولایت غیر اجباری اور صغیرہ پر اجباری ہے، جبکہ باقی فقہا بالغہ پر بھی ولی کی ولایت کو اجباری کہتے ہیں۔ ان کے ہاں بالغہ لڑکی کا نکاح بھی ولی کرے گا۔ احناف کے ہاں بالغہ لڑکی اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔ اسی پر ہماری عدالتیں فیصلے دے رہی ہیں۔ ہمارے ہاں آج کل لڑکیاں گھر سے فرار ہو کر چلی جاتی ہیں اور اپنی مرضی سے نکاح کر لیتی ہیں اور پھر ان کے ماں باپ عدالت میں مقدمہ لے کر آتے ہیں کہ فلاں نے ہماری بیٹی کو دروغ لایا اور بھاگ کر لے گیا۔ اس پر عدالت میں وہ لڑکا لڑکی بھی پیش ہوتے ہیں اور آئ کر کہتے ہیں کہ ہم نے تو شادی کی ہے۔ اب عدالت اس شادی کو قبول کر لیتی ہے اور ماں باپ سے کہتی ہے کہ آپ کی چھٹی، آپ اپنے گھر جائیے اور یہ لوگ اپنے گھر جائیں گے۔ عدالتیں یہ فیصلے احناف کے اس موقف کے حوالہ سے دیتی ہیں کہ بالغ لڑکی اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے۔

گز شستہ دنوں ایک واقعہ ہوا کہ ایک لڑکی گھر سے نکل گئی۔ ایک دو مہینے مختلف ہو ٹلوں وغیرہ میں لڑکے کے ساتھ رہتی۔ ماں باپ نے عدالت میں شکایت کی۔ اس پر وہ لڑکا لڑکی بھی عدالت میں پیش ہوئے اور کہا کہ ہم نے تو شادی کر لی ہے۔ عدالت نے ماں باپ سے کہا کہ بھی، آپ اپنا کام کریں، یہ تو میاں بیوی ہیں۔ فیصلہ اسی حوالے سے تھا کہ چونکہ امام ابو حنیفہ یہ موقف رکھتے تھے، اس لیے اس کی رو سے لڑکی کو اپنی مرضی سے شادی کا حق حاصل تھا۔ اس پر میں نے نجح کو ایک مضمون میں لکھا کہ کیا امام صاحب کا صرف ایک ہی قول تمہیں ملا ہے؟ امام صاحب نے باقی جو

کچھ کہا ہوا ہے، وہ تمہاری نظر سے کیسے چھپا رہ گیا؟ میں نے کہا کہ مقدمے کے ریکارڈ کے مطابق لڑکی گھر سے از خود نکل کر گئی ہے۔ ایک دو مہینے اس لڑکے کے ساتھ ہوٹلوں میں رنگ روپیاں مناتی رہی ہے اور اس کے بعد نکاح ہوا ہے۔ اس معااملے میں بھی امام ابو حنفیہؓ کچھ کہتے ہیں یا نہیں؟ اس کا تم نے کیا نوش لیا ہے؟ تمہیں صرف آخر میں جا کر ہی فقة حنفی یاد آئی ہے؟

یہ لوگ امام صاحب کے قول کے حوالے سے جو یہ فیصلہ دیتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام صاحب ان کے لیے کوئی اتحارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ اس سے ان کو گنجائش ملتی ہے۔

لاہور کا ایک مشہور کیس تھا، صائمہ کیس۔ ایک روپڑی خاندان ہے جو اہل حدیث علام کا خاندان ہے۔ ان کی ایک بالغ لڑکی کا لمح میں ایک لڑکے کے ساتھ نکل گئی اور شادی کر لی۔ عدالت میں کیس آگیا۔ بی بی سی، وائس آف امریکہ، سی این این، وائس آف جمنی اور دنیا کے اخبارات میں اس کا چرچا ہوا کہ مولویوں کی لڑکی بھاگ گئی اور نکاح کر لیا۔ ان لوگوں کو وہابی یا دیوبندی سے غرض نہیں ہے، ان کو تو مولوی سے غرض ہے۔ اب اہل حدیث کے ہاں شوافع کے قوں کو مانا جاتا ہے کہ بالغ لڑکی کو ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کا حق نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر انہوں نے مقدمہ دائر کر دیا کہ نکاح نہیں ہوا، جبکہ بعض خنفی علماء کرام نے اس کے مقابلہ میں عدالت میں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

### ولایت اور کفاءت کا مسئلہ

جب یہ مقدمہ منظر عام پر آیا تو میں نے بھی اس کا مطالعہ شروع کیا۔ اس مسئلے پر فیض الباری میں علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ نے خوب بحث کی ہے۔ شاہ صاحب کے مطابق امام صاحبؓ کی طرف جو یہ موقف منسوب ہے، مطلقاً درست نہیں ہے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ بالغہ کی شادی اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتی اور بالغہ کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ولی اور کفوکا احترام کرے۔ ان دونوں باتوں کو شامل کر کے شاہ صاحب نے خنفی موقف یہ قرار دیا کہ اجتماع رضا نہیں شرط ہے۔ ولی، بالغہ کی مرضی کے بغیر اس کی شادی نہیں کر سکتا اور بالغہ، ولی

کی مرضی کے بعد اپنی شادی نہیں کر سکتی۔ علامہ سید انور شاہ کاشمیریؒ کے مطابق احتراف کا اصل موقف یہ ہے کہ اجتماع رضا کیں شرط ہے۔ میں نے یہ سارا موقف تحریری صورت میں مرتب کیا اور علماء کرام کی خدمت میں پیش کر دیا۔ الحمد للہ سب علماء دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث بلکہ اہل تشیع نے بھی میرا یہ موقف قبول کیا۔ سب کے مشترکہ دستخطوں سے ہائیکورٹ میں ہمارا یہ موقف داخل ہوا۔

احتراف کے موقف کے حوالے سے ایک پرانا واقعہ بھی ذہن میں آ گیا۔ بریلوی دیوبندی تقسیم جب برصغیر میں شروع ہوئی ہے تو سب سے پہلی بڑی شخصیات جو دونوں طرف سے تھیں، ان میں بریلویوں کی طرف سے مولانا احمد رضا خان بریلوی اور دیوبندیوں کی طرف سے مولانا رشید احمد گنگوہی تھے۔ اس زمانہ میں ایک بالغ لڑکی نے ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفوئیں نکاح کر لیا۔ اب احتراف کے ہاں ولی کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔ اس اعتراض سے اگلا مرحلہ یہ آتا ہے کہ آیا نفس اعتراض سے نکاح فتح ہو جاتا ہے یا قضا اور تھکیم سے ہوتا ہے؟ اس میں احتراف کے ہاں دو آراء ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ نفس اعتراض سے نکاح فتح ہو جاتا ہے جبکہ دوسری رائے میں یا تھکیم سے ہو گایا قضا سے۔ اس پر ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ فتاویٰ رشیدیہ میں پڑھ لیں۔ یہ اُس دور کی بات ہے۔ مذکورہ لڑکی کی اس حرکت پر باپ نے اعتراض کر دیا کہ میری توہین ہوئی ہے، میری عزت مجروح ہوئی ہے، مجھے یہ نکاح قبول نہیں ہے۔ اب مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ باپ کے قبول نہ کرنے سے یہ نکاح باقی رہ گیا یا نہیں۔ فتویٰ کے لیے سوال گیا مولانا احمد رضا خان بریلوی کے پاس۔ انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ نکاح ختم ہو گیا ہے۔ اب یہی سوال مولانا رشید احمد گنگوہی کے پاس گیا تو مولانا گنگوہی نے کہا کہ نہیں بھی، اعتراض کا حق تو ہے، لیکن نکاح ختم ہو گا یا تھکیم سے یا قضا سے۔ اب یہ دونوں فتوے محاکے کے لیے حضرت مولانا عزیز الرحمنؒ کے پاس گئے جو کہ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں مفتی اعظم تھے۔ مفتی صاحب نے ایک جملہ اس میں لکھا کہ مجیب اول کا جواب درست ہے۔ مجیب اول تو مولانا احمد رضا خان بریلوی تھے جو کہ مخالف تھے، جبکہ دوسری طرف مولانا رشید احمد گنگوہی خود مولانا عزیز الرحمنؒ کے استاذ تھے۔ لیکن آپ ان کی

نقہی دیانت دیکھیے کہ جس موقف کو صحیح سمجھا، وہی بیان کیا قطع نظر اس سے کہ یہ اپنے ہی استاذ کے مخالف کے حق میں جا رہا ہے۔

خیر، میں یہ بتارہا تھا کہ دفعہ نمبر ۱۶ کو عقیدے اور اصول کے طور پر تسلیم کرنے سے نگاہ کے انعقاد میں ہمارے ہاں جو ولایت، کفاءت وغیرہ کے احکامات ہیں، سب ختم ہو جاتے ہیں۔

### میاں بیوی کے درمیان اختیارات کا توازن

زیر بحث شق کا اگلا جملہ ازدواجی زندگی کے دوران میاں بیوی کے حقوق و اختیارات سے متعلق ہے۔ اسلام کا واضح قانون ہے:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ  
وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أُمُوَالِهِمْ (النساء: ۳۲)

اس کا اولین مصدق خاندان ہے۔ عمومی مصدق میں ملک کی حکومت بھی مراد لی جاتی ہے، لیکن اولین مصدق یہی ہے کہ مرد گھر کا حاکم ہے اور لرِ جال عَلَيْهِنَّ دَرَجَةً (البقرہ: ۲۲۸) گھر کے نظم کا حکمران مرد ہے۔ اس کی دو وجہات بھی قرآن کریم نے بیان کی ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ نے مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے۔ اس سے اس دنیا کی فضیلت مراد ہے کہ اللہ نے مرد کی عقلی و جسمانی ساخت ایسی بنائی ہے کہ وہ عورت کی جسمانی و عقلی ساخت پر حاوی ہے۔ مرد میں فعالیت ہے اور عورت میں انفعاالت ہے۔ دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ عورت پر مال خرچ کرتا ہے۔ اب یہ مال خرچ کرنے والی بات مغربی ممالک میں تو نہیں ہے کیونکہ وہاں مرد بھی کہاتا ہے اور عورت بھی، لیکن بات یہ ہے کہ اسلام ایک جامع خاندانی نظام پیش کرتا ہے جس میں مرد کے ذمہ گھر کے باہر کی ذمہ داریاں ہیں اور عورت کے ذمہ گھر کے اندر کی ذمہ داریاں ہیں۔ اس سے ایک متوازن معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اب آپ مغرب کی طرف ہی دیکھ لیں۔ وہاں عورت گھر سے باہر نکل کر پیسے تو کمالیتی ہے، لیکن مجموعی طور پر معاشرہ خاندانی اقدار اور ان کی افادیت سے تھی دامن ہے۔ چنانچہ اسلام میں گھر کا حکمران مرد ہے۔ عورت حاکم تو نہیں ہے، لیکن گھر کی چار دیواری کے اندر ایک تنظیم ضرور ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے کہ: وَالمرأة راعية على بيت

بعلہا و ولدہ وہی مسئولہ عنہم (بخاری، رقم ۲۵۵۳) لیکن بالآخری مرد کو حاصل ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی نظام، چھوٹا ہو یا بڑا، اس میں فائیل اتحاری ایک ہاتھ میں ہو گی تو نظام چلتا ہے، دو ہاتھوں میں یکساں ہو تو نظام نہیں چلتا۔ ایک ملک کے دو صدر ہوں یا ایک کمپنی میں یکساں اختیار رکھنے والے دو پریزینٹس ہوں تو نظام نہیں چل سکتا۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ کائنات کا نظام ہزارہا برس سے صحیح کیوں چل رہا ہے؟ اس لیے کہ ان کا کثروں ایک ہاتھ میں ہے۔ قرآن کہتا ہے: **لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَ تَا فَسْبُحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ** (الأنبياء: ۲۲) یعنی اگر اختیارات کسی اور کے پاس بھی ہوتے تو بیڑا غرق ہو جاتا۔ **إِذَا أَذَّهَبَ كُلُّ إِلَهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَّا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ** (المؤمنون: ۹۱) ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کے ساتھ الگ کھڑا ہوتا۔ ہر وقت جھگٹے ہی ہوتے رہتے۔ توحید کا فلسفہ یہی ہے کہ ایک ہی اللہ ہے جو ہر چیز کا حاکم اور مالک ہے۔ کسی بھی ادارے کا، کسی بھی کمپنی کا نظام اس وقت صحیح چلتا ہے جب اس کی فائیل اتحاری ایک ہاتھ میں ہو گی۔ گھر بھی ایک نظام ہے، اس کی فائیل اتحاری بھی ایک ہاتھ میں ہو گی تو نظام چلے گا۔ دو ہاتھوں میں ہو گی تو بیڑا غرق ہو جائے گا جیسے کہ مغرب کے خاندانی نظام کا ہو چکا ہے۔ آج مغرب سرپکڑے بیٹھا ہے کہ فیملی سسٹم کدھر گیا؟ میں آپ کو مغرب کے خاندانی نظام کا نقشہ بتاتا ہوں۔

## مغرب کا خاندانی نظام

مغرب کی صورت حال یہ ہے کہ چپا، پھوپھی، خالہ کے رشتے تو گم ہو، ہی گئے ہیں، والدین کے رشتے بھی بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ باپ بھی اولڈ ہوم میں، ماں بھی اولڈ ہوم میں۔ میاں بیوی کی آپس کی لڑائیوں کے نتیجے میں وہاں شادی کے قوانین ایسے سخت ہیں کہ لوگ شادیاں کرنا گوارا ہی نہیں کرتے، بغیر شادی کے ہی اکٹھے رہے رہتے ہیں۔ کسی جوڑے کی سال دوسال ساتھ رہنے کے بعد اندر رشینڈنگ ہو گئی تو شادی ہو جائے گی، ورنہ کسی نئے ساتھی کی تلاش میں الگ ہو جائیں گے۔ کسی جوڑے کی شادی دو چار سال چل جائے تو اسے بڑی کامیاب شادی تسلیم کیا جاتا

ہے۔ بچے پیدا کرنا تو ان کی ترجیحات میں کوئی چوتھی پانچویں نمبر کی ترجیح ہوتا ہے۔ بچوں پر کیمیریز کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور اگر کسی جوڑے کو شوق آہی گیا بچے کا تو ماں کے پاس تو بچے کے لیے وقت نہیں ہے، اس نے تو اپنے کام پر جانا ہے۔ اس صورت میں ماں کام پر جاتے ہوئے اپنے بچے کو بے بی سٹنگ کے لیے کسی ڈے کیٹر سٹنٹر کے حوالے کر جاتی ہے۔ ایسے سٹنٹر کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک معقول معاوضہ کے عوض ماوں کی غیر موجودگی میں ان کے بچوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ کام کرنے والی بھی خواتین ہوتی ہیں جو بچوں کی دلکشی بھال کرتی ہیں۔ اب ماں کسی اور کے لیے کام کر رہی ہے اور اس کے بچے کی دلکشی بھال نکے لیے کوئی عورت اس کے لیے کام کر رہی ہے۔ میاں اپنے کام پر، بیوی اپنے کام پر، بچوں کے لیے تو وقت ہی نہیں ہوتا۔ جب دونوں کماتے الگ الگ ہیں تو پھر خرچ بھی اپنا اپنا کرتے ہیں۔ گھر کے خرچے میں دونوں شریک ہوتے ہیں۔ آخر میں تصور یہی سامنے آتی ہے کہ دونوں نے اپنی جسمانی ضروریات کے لیے ایک سمجھوتہ کیا ہوا ہے اور بس۔ اور اکثریت تو اس بات کو بھی گوارا نہیں کرتی کہ جسمانی ضرورت کے لیے کسی ایک ساتھی کو مستقل اپنے ساتھ چھٹائے رکھو۔ یہ میں مجموعی صورت حال بتارہا ہوں۔ بہت سے خاندان ابھی بھی ہیں جو پرانی روایات پر چلتے ہوئے با قاعدہ رشتہ دار یاں قائم کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں بچے کی پہچان کے لیے باپ کا نام لکھتے ہیں۔ مغرب میں مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ اکثر یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ فلاں شخص کا باپ کون ہے۔ جب باپ کا پتہ نہیں ہو گا تو پچا، بچوں بھی اور کزن وغیرہ کہاں سے آئیں گے۔ اس لیے مغرب میں بچے کی پہچان ماں کے نام سے کی جاتی ہے۔ اسے سنگل پرینٹ کا قانون کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایک این جی اونے مطالبه کیا کہ یہ قانون ہمارے ہاں بھی نافذ کیا جائے۔ میں نے کہا بی بی، ہمارے ہاں ہزار میں سے نو سو نانوے لوگوں کو اپنے باپوں کا پتا ہوتا ہے۔ ہمیں کوئی ایسی دقت پیش نہیں آتی جس کے لیے یہ قانون نافذ کیا جائے۔ روس کا سابق صدر گورباچوف مغرب کے بڑے دانشوروں میں سے ہے۔ روس کی جان اسی نے کمیوزم سے چھڑوائی ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے: پرو مٹرائیکا۔ اس کتاب میں اس نے مغرب کے فیملی سٹم پر بحث کی ہے۔ گورباچوف کہتا ہے کہ مغرب میں بھی

خاندانی نظام بہت مضبوط تھا، لیکن پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں یہ ہوا کہ لاکھوں کروڑوں افراد مارے گئے جس سے افرادی قوت کا خلا پیدا ہو گیا۔ صورت حال یہ ہو گئی کہ کارخانوں میں مزدور نہیں، دفتر میں کلرک نہیں، تعلیمی اداروں میں اساتذہ اور عملہ نہیں۔ افرادی قوت ختم ہو گئی جس سے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ گورباچوف کہتا ہے کہ ہم نے عورت کو ورغلایا کہ ہم تمہیں مردوں کے برابر کے حقوق دیتے ہیں۔ ہم نے عورت کو افرادی قوت کا خلا پر کرنے کے لیے گھر سے نکالا تا کہ فتر خالی شر ہیں، فیکٹریاں اور اسکول خالی شر ہیں۔ لیکن اس سے ہوا یہ کہ ہمارے دفتر، اسکول، کارخانے تو نجع گئے، مگر گھر کا سارا نظام بر باد ہو گیا۔ اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ عورت واپس اپنے گھر جائے اور گھر کے انتظامات سنجا لے، لیکن اب عورت اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ گورباچوف کہتا ہے کہ ہم تواریخ ڈھونڈنے کے لیے کسی طرح عورت کو اس بات پر آمادہ کر لیں کہ وہ گھر میں رہے کہ گھر میں رہنا اس کے لیے بہتر ہے۔

### اسلام کا خاندانی نظام اور مغربی داش ور

برطانیہ کے ایک قومی سٹٹ کے سیاسی لیڈر کا چند مہینے پہلے ایک طویل اشتو یوا خبارات میں شائع ہوا۔ اس میں اس نے کہا کہ میں اپنے ایک مسلمان دوست کے ہاں ۲۳ گھنٹے کے لیے جا کر رہا ہوں، یہ دیکھنے کے لیے ان کا فیملی سٹم کیا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے رشک آتا ہے کہ آپس میں ان کا اتنا جوڑ ہے۔ اس نے کہا کہ میرے وہاں رہنے کے دوران ان کے اتنے رشتہ دار ملنے کے لیے آئے کہ میرے ہاں کبھی سال میں اتنے نہیں آئے۔ اور یہ رشک کا لفظ صرف برطانوی لیڈر نے نہیں، بلکہ امریکہ کی سابق خاتون اول ہیلری کلنٹن نے بھی بولا تھا۔ جن دنوں یہ خاتون اول تھی، اس نے اسلام آباد کا دورہ کیا۔ اس کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی تھی جس میں اس نے کہا تھا کہ مجھے مشرق کا خاندانی نظام دیکھ کر رشک آتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں ایک نوجوان لڑکی اپنے ماں، چاچا، پھوپھی، خالہ کے حصار میں ہے۔ یہاں ”حصار“ کا لفظ اس نے حفاظت کے معنی میں استعمال کیا۔ ہیلری کلنٹن نے اپنے دورے کے دوران اسلام آباد کے ایک ویمن کالج کا دورہ کیا۔ اس نے وہاں کی ایک لڑکی سے پوچھا کہ اپنی تعلیم کے دوران عام طور پر تمہیں کیا مسئلہ

درپیش ہوتا ہے؟ لڑکی نے کہا کہ ہم یہاں تعلیم حاصل کرتی ہیں، لیکن ہمیں اپنی ریسرچ کے لیے لائبریریز، لیبارٹریز اور متعلقہ وسائل کی کسی کا سامنا ہے جس کی وجہ سے ہماری تعلیم کمزور رہ جاتی ہے۔ پھر اس لڑکی نے امریکی صدر کی بیوی سے پوچھ لیا کہ آپ کے ہاں کانج کی لڑکی کو کیا مسئلہ درپیش ہوتا ہے؟ ہیلری نے کہا کہ ہمارے ہاں کانج تک پہنچتے پہنچتے لڑکی کی گود میں بچہ ہوتا ہے اور اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ یہ تو ہیلری نے کہا، لیکن اگر بچہ نہ ہو تو بھی وہ اس وقت تک ان گنت لوگوں کی ہوس کا نشانہ بن چکی ہوتی ہے جس میں بے احتیاطی کے نتیجے میں کئی لڑکیوں کو ابشار کے مرحلے سے بھی گزرنما پڑتا ہے۔

میں نے اس پر مضمون لکھا کہ بی بی، اسلام کا نظام دیکھو۔ قرآن کہتا ہے کہ: **أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِرِينَ** (النساء: ۲۳) کہ اگر کسی عورت کو ساتھ لے گانا ہے تو پہلے اس کی مالی ذمہ داری قبول کرو، مہر بھی اور ننان نفقة بھی اور پھر اس کا مقصد گھر بسانا ہو، صرف شہوت مقصد نہ ہو، اور گرل فرینڈ نہیں، بلکہ خاندان بنانا مقصود ہو۔ اسی طرح لڑکیوں کو بھی کہا: **وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانَ** (النساء: ۲۵) یعنی اسلام کہتا ہے کہ عورت کو اپنی بیوی کے طور پر قبول کرو، اس کے اور بچوں کی مالی ذمہ داری قبول کرو تو پھر جنسی خواہش کی طرف آؤ۔ نیز یہ رشتہ ریکارڈ پر ہو، خفیہ نہ ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک مضمون میں ہیلری سے مخاطب ہو کر کہا کہ اسلام کا ستم دیکھو، کتنا محفوظ اور نیچرل سٹم ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ تم جو کچھ عورت کے ساتھ کرنا چاہتے ہو، اس کے تمام ترمکنہ نتائج کی ذمہ داری قبول کرتے ہو تو اس کے قریب جاؤ، ورنہ کوڑے لگیں گے اور بعض صورتوں میں سنگار بھی ہو سکتے ہو۔

## عورت پر مغرب کا دوہرہ اظلم

گورپاچوف نے کہا کہ ہم نے عورت کو افرادی خلاپ کرنے کے لیے ورغلایا اور نعرہ یہ لگایا کہ ہم عورت کو مردوں کے مساوی حقوق دے رہے ہیں۔ اس پر میں نے بمنگھم میں ایک جگہ اپنی تقریب میں کہا کہ دیکھو، عورت کے ذمے گھر کے فرائض ہیں، خاوند کے ذمے باہر کی ذمہ داریاں ہیں۔ یہ قدرت کی تقسیم کا رہے کہ زندگی کے کچھ کاموں کی ذمہ داری عورت کے سپرد ہے اور کچھ مردوں

کے سپرد۔ مثلاً جو کام عورت کر سکتی ہے، وہ کام مرد تو نہیں کر سکتا۔ بچہ جننا، اسے دودھ پلانا، اس کی پروش کرنا عورت کا کام ہے، مرد یہ نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ یہ عجیب لوگ ہیں، انہوں نے عورت کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے کہ اسے کمانے میں تو اپنے ساتھ شریک کر لیا، لیکن اس کی کسی ڈیوٹی میں خود شریک نہیں ہوئے کہ چلو ایک بچہ تم جنو، ایک میں جتنا ہوں۔ یا ایک کوم دودھ پلاؤ، دوسرے کو میں پلاتا ہوں، یا ایک بچے کو نہلانے دھلانے، اس کی جسمانی ضروریات کا تم خیال رکھو اور دوسرے کا میں رکھتا ہوں۔

اب عورت بچہ بھی بننے گی، اسے دودھ بھی پلانے گی، اس کی پروش بھی کرے گی اور کمائے گی بھی۔ واضح طور پر مرد کو اپنی ذمہ داری میں شریک کیے بغیر عورت اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مرد کی ذمہ داریوں میں شریک ہوئی ہے۔ آیا یہ حقوق میں اشتراک ہے یا فرائض میں اشتراک ہے؟ عورت کے حقوق میں اضافہ ہوا ہے یا فرائض میں؟ ذرا کھلے ذہن سے اس پر غور کریں۔ اور اس سارے معاملے کو عنوان کیا ملا ہے؟ عورت کے مردوں کے ساتھ مساوی حقوق۔ اب آپ ہی بتائیے، عورت ناقص العقل ہے یا نہیں؟ اضافہ تو ہوا ڈیوٹی میں اور وہ خوش اس بات پر ہے کہ میرے حقوق برابر ہو گئے۔

یہ ڈے کیسٹرز بچوں کے سنبھالنے کا کام کرتے ہیں جہاں مائیں اپنے بچوں کو صبح ڈال جاتی ہیں اور شام کو لے جاتی ہیں۔ اب اس سارے سسٹم سے کام تو چل جاتے ہیں، لیکن خاندان کا ایک نظام جو قدرت نے قائم کیا، اس کا سارا استیانا اس ہو گیا جس کے سوسائٹی پر اجتماعی نقصانات کو مغرب کے دانشور نہ صرف شدت سے محسوس کر رہے ہیں بلکہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ہمیں اپنی خاندانی اقدار کی طرف واپس جانے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات عرض کرتا ہوں اور پھر ہم اس دفعہ کی تیسری شق پر بات کریں گے۔ ترکی ہمارا بار اسلامی ملک ہے۔ ترکی نے یورپ میں شامل ہونے کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ خلافت اور دین چھوڑنے کے علاوہ بہت سی دینیوی قربانیاں بھی دی ہیں، صرف اس لیے کہ ترکی کو یورپیں شمار کیا جائے۔ ۱۹۲۳ء میں خلافت ختم کی، ہمیشہ عدالتیں ختم کیں، مدارس ختم

کیے، مسلمانوں کی قیادت سے دست برداری اختیار کی، اس لیے کہ ہمیں یورپی یونین کا ممبر بنایا جائے۔ بہت ملتیں کیس، ناک رگڑے، لیکن یورپی یونین اسے قبول نہیں کر رہی۔ یورپی یونین شرطیں لگاتی رہتی ہے، کبھی یہ شرط کبھی وہ شرط۔ ابھی چند سال پہلے یورپی یونین نے ایک نئی شرط لگائی کہ تمہارے ہاں قوانین میں جب کنبے کا ذکر ہوتا ہے تو کنبے کا سربراہ مرد کو لکھا جاتا ہے۔ یہ مرد اور عورت کی مساوات کے خلاف ہے، چنانچہ یہ انسانی حقوق کے منافی ہے۔ چنانچہ ترکی کی اسمبلی نے باقاعدہ قرارداد کر کے یہ قانون ختم کیا کہ مرد کنبے کا سربراہ ہے۔ اس کے باوجود یورپی یونین کی رکنیت اسے نہیں ملی۔

امریکی سپریم کورٹ میں کچھ عرصہ پہلے ایک رٹ دائر ہوئی تھی کہ میں الاقوامی قانون اور امریکی دستور یہ کہتا ہے کہ مرد اور عورت میں مساوات ہے، ان میں کوئی فرق نہیں، لیکن جب بھی خدا کا ذکر ہوتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ”خدا کہتا ہے“، یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ ”خدا کہتی ہے“۔ اس پر سپریم کورٹ کے یہ ریمارکس اخبارات کی زینت بنے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ دونوں کہہ سکتے ہیں۔ کبھی یہ کہ ”خدا کرتا ہے“، کبھی یہ کہ ”خدا کرتی ہے“۔

دفعہ نمبر ۱۶ کی تیسری شق کے مطابق فتح نکاح میں دونوں کا حق برابر ہے۔ جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق ہے، اسی طرح عورت کو بھی برابر کا طلاق دینے کا حق ہے، جبکہ اسلام میں مرد کو براہ راست طلاق کا جبکہ عورت کو مطالبة طلاق کا حق حاصل ہے جسے خلع کہا جاتا ہے۔ اگر خاوند عورت کے مطالبة پر طلاق نہ دے تو عورت کو تحریک یا قضا کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہے:

فَإِبْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا۔ (النساء: ۲۵)

اب اگر عورت حق پر ہے، خاوند زیادتی پر ہے تو تحریک یا قضا کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خاوند کی مرضی کے بغیر عورت کے لیے طلاق صادر کر دے۔ چنانچہ اسلام میں عملی طور پر مرد اور عورت دونوں کو طلاق کا حق حاصل ہے، لیکن ترجیحات کا فرق ہے۔ مرد کو بلا واسطہ، جبکہ عورت کو بالواسطہ طلاق کا حق حاصل ہے۔ حکمت اس میں یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک کا فیصلہ میں برتر ہونا نظم کے لیے ضروری ہے۔ دونوں کے اس انتہاری میں برابر ہونے سے خاندان مستحکم نہیں رہے گا۔

## عورت کو طلاق کا حق

یہ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کو بھی مساوی طلاق کا حق دو۔ ہمارے حکمران دو طرفہ پالیسی اپنائے ہوئے ہیں۔ ہماری طرف سے دباؤ ہوتا ہے تو ہمیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور مغرب کی طرف سے دباؤ ہوتا ہے تو ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایوب خان مرحوم کے زمانے میں عالمی قوانین نافذ ہوئے۔ اسی وقت نکاح کے فارم بھی بنے۔ نکاح کے فارم میں ایک تفویض طلاق کا خانہ بنایا گیا۔ فارم کا سوال کچھ اس طرح ہے: ”کیا خاوند نے یہوی کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے؟“

اسلامی طور پر خاوند اگر یہوی کو طلاق کا حق تفویض کر دے تو پھر یہوی کو بھی برابر کا طلاق کا حق مل جائے گا، لیکن ہوتا یہ ہے کہ نکاح کے وقت نکاح خواں میاں یا یہوی، کسی سے نہیں پوچھتا۔ ایک دفعہ میں نے ایک نکاح خواں کو نکاح کا فارم پر کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ جب اس سوال پر پہنچا تو اس نے خود ہی اس پر کراس لگادیا۔

ایک لطیفے کی بات ذہن میں آگئی۔ ہمارے پاکستان کی سیاست کی ایک معروف خاتون ہیں۔ وہ ایک صاحب کے نکاح میں تھیں۔ میکے گئیں اور چند مہینوں کے بعد ایک اور زداح کر لیا۔ خاوند نے اعتراض کر دیا کہ یہ تو میری یہوی ہے، اس نے نیا نکاح کیسے کر لیا؟ اس نے کہا کہ میں تو تمہاری یہوی نہیں رہی، اس لیے کہ تم نے مجھے نکاح کے فارم میں طلاق کا حق تفویض کیا تھا۔ میں نے وہی حق استعمال کیا ہے جو کہ شرعی بھی ہے اور قانونی بھی۔ میں نے خود ہی طلاق دی ہے، عدت گزاری ہے اور دوسرا نکاح کر لیا ہے۔ اب وہ صاحب کہنے لگے کہ مجھے تو اس تفویض طلاق کے حق کا کچھ بھی پتہ نہیں ہے۔ بات عدالت میں چلی گئی۔ فیصلہ اس پر قرار پایا کہ اگر فارم میں تفویض طلاق کے سوال کے سامنے خانہ میں ہاں ہے تو پھر طلاق ہے، اگر نہیں تو پھر طلاق قرار نہیں پائی۔ عدالت نے فارم منگوائے۔ فارم پر اس سوال کے خانہ میں ہاں لکھا تھا، جبکہ وہ صاحب کہتے ہیں کہ مجھے تو نکاح کے وقت کسی نے اس کے متعلق نہیں پوچھا۔ عملی طور پر ہوا یوں کہ وہ حق نکاح خواں نے خود ہی ان محترمہ کو تفویض کر دیا تھا۔

اس بات کو مرد اور عورت کی مساوات کے خلاف کہا جا رہا ہے کہ آپ لوگ عورت کو طلاق کا وہ حق نہیں دیتے جو خاوند کو ہے۔ اقوام متحده کے منشور نے جن باتوں کو عقیدے میں شمار کیا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ مرد اور عورت میں مساوات ہو۔ اس کے خلاف کوئی بھی بات ہوتا ہے جس کی بنیاد پر امتیاز شمار کیا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر ہماری حکومت سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جس کی بنیاد پر امتیاز کے تمام قوانین ختم کیے جائیں۔ بظاہر یہ نظرہ بہت خوشنما ہے کہ امتیازی قوانین ختم کر دیے جائیں۔

یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ امتیازی قوانین سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔ ایک کہتے ہیں جس کی بنیاد پر امتیاز اور دوسرا مذہب کی بنیاد پر امتیاز۔ جس کی بنیاد پر امتیاز کا مطلب یہ ہے کہ کسی معاملہ میں مرد کے لیے قانون اور ہو اور عورت کے لیے کوئی اور ہو۔ لہذا یہ قانون کہ مرد کو براہ راست طلاق کا ہے جبکہ عورت کو نہیں، امتیازی قانون قرار پاتا ہے۔ اسلام میں مرد کو حکمرانی کا حق حاصل ہے جبکہ عورت کو نہیں۔ نماز کی امامت کے لیے مرد کو امام بننے کی اجازت ہے جبکہ عورت کو نہیں۔

ہمارے ہاں ایک مرد کی گواہی کے برابر دو عورتوں کی گواہی تسلیم کی جاتی ہے: فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ (البقرة: ۲۸۲)۔ ہمارے ہاں مرد پابند نہیں ہے کہ وہ گھر سے باہر جائے تو پوچھ کر جائے۔ عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ولی (خاوند، والد، بھائی وغیرہ) سے اجازت لے کر گھر سے جائے۔ مرد اس بات کا پابند نہیں ہے۔ ہمارے ہاں وراثت میں مرد کا حصہ مختلف ہے اور عورت کا مختلف۔ یہ ساری باتیں جس کی بنیاد پر امتیاز قرار پاتی ہیں۔ اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ جس کی بنیاد پر کوئی قانون رو انہیں رکھیں گے تو اس سے مراد قرآن و سنت کے وہ تمام احکام لیے جاتے ہیں جن میں کسی معاملے میں مرد کے لیے مختلف حکم ہو اور عورت کے لیے مختلف۔ اقوام متحده کا منشور کہتا ہے کہ ہم ایسے تمام قوانین ختم کر کے مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات قائم کریں گے۔

دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ ملک میں مذہب کی بنیاد پر کوئی امتیاز کا قانون نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً ہمارے قانون میں ہے کہ ملک کا نہ تو صدر کوئی غیر مسلم ہو سکتا ہے اور نہ وزیر اعظم۔ اسے مذہب کی بنیاد پر امتیاز کہا جاتا ہے۔ مسلمان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سوسائٹی میں اپنے مذہب کی تبلیغ و پرچار

کرے۔ غیر مسلم کو یہ حق نہیں دیا جاتا کہ وہ مسلم سوسائٹی میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرے۔ چنانچہ جب نعرہ لگتا ہے کہ مذہبی امتیاز کے قوانین ختم کر دیے جائیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جہاں بھی آپ مذہب کے حوالے سے قانون اور ضابطے میں فرق کرتے ہیں، ان سب قوانین کو ختم کر دیا جائے۔

ہمارے حکمرانوں نے عورت کو طلاق کا حق دینے کے حوالے سے ایک حیلہ اختیار کیا کہ نکاح کے فارم میں ایک شق رکھ دی کہ آیا مرد عورت کو طلاق کا حق تفویض کرنا چاہتا ہے یا نہیں اور مغرب کو یہ فارم دکھا دیا گیا کہ ہم نے عورت کو طلاق کا حق دے دیا ہے۔ ہمارے ہاں طلاق کا جو قانونی سسٹم رانج ہے، وہ یہ ہے کہ خاوند جب طلاق لکھ دیتا ہے تو اس کے لکھنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ وہ طلاق نامہ عورت کو مل بھی جائے، پھر بھی واقع نہیں ہوتی۔ مروجہ قانون کے مطابق خاوند طلاق لکھ کر ٹالشی کو نسل کو بھیج گا۔ ٹالشی کو نسل یہ ناظم وغیرہ ہوتے ہیں۔ ٹالشی کو نسل کو قانونی طور پر ہدایت ہے کہ جب بھی آپ کو کوئی طلاق کا نوٹس ملے تو آپ فریقین کو بلا کر صلح کروائیں، قطع نظر اس کے کہ طلاق کی نوعیت کیا ہے۔ طلاق رجعی ہے، بائُن ہے، مغلظہ ہے یا فتح نکاح ہے، ٹالشی کو نسل کو اس سے غرض نہیں ہے۔ قانون کے مطابق اگر ٹالشی کو نسل خاوند اور یوں میں صلح کرانے میں کامیاب ہو جائے تو طلاق واقع نہیں ہوئی، چاہے طلاق رجعی ہو، بائُن ہو، یا کچھ بھی ہو۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ٹالشی کو نسل صلح کرانے میں ناکام ہو گئی اور اس نے طلاق کی توثیق کر دی تو اب قانون ٹالشی کو نسل کے دستخطوں کے بعد طلاق واقع ہو گئی۔ اب طلاق بھی یہیں سے شمار کی جائے گی اور عدت بھی، چاہے اصل طلاق کو چھ مہینے ہی کیوں نہ گزر گئے ہوں۔ یعنی ہمارے قانون کے مطابق طلاق کا وقوع ٹالشی کو نسل کے طلاق نامہ پر دستخط سے ہوتا ہے۔

اسی ضمن میں ایک لطیفے کی بات اور ذہن میں آگئی ہے۔ ایک دفعہ میں گوجرانوالہ کے ایک حلقہ کے ناظم صاحب سے ملنے گیا۔ ہمارے اچھے دوست ہیں۔ وہ اتفاق سے اس وقت ٹالشی کو نسل کے طور پر طلاق کا ایک مقدمہ سن رہے تھے۔ اس نے فریقین کو بلا کر کھا تھا اور صلح کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بھی بیٹھ گیا کارروائی دیکھنے کے لیے۔ اس نے کوئی آدھ پون گھنٹہ کوشش کی لیکن صلح کرانے

میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ خاتون صلح کے لیے آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ اب ناظم صاحب خاتون سے کچھ اس طرح سے مخاطب ہوئے، ”صلح نہیں کرو گی تو پھر میں طلاق دے دوں؟“ میرے تو اس جملے پر کان کھڑے ہو گئے کہ یہ ناظم صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ طلاق آپ نے دینی ہے یا خاوند نے؟ وہ بھی مذاق سے کہنے لگے کہ مولانا صاحب، یہاں تو میں نے ہی دینی ہے۔ میں نے طلاق کے کاغذات اٹھا کر دیکھے تو شرعی لحاظ سے اس طلاق کو واقع ہوئے اڑھائی مہینے گزر چکے تھے۔ اب اتنے عرصے کے بعد ناظم صاحب عورت سے پوچھ رہے تھے کہ اگر تم نے صلح نہیں کرنی تو میں طلاق دے دوں!

بہر حال پہلا حیلہ اس سلسلے میں ہمارے حکمرانوں نے یہ اختیار کیا کہ تفویض طلاق کا خانہ نگاہ نامے کے فارم میں شامل کر کے مغرب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ ہم نے اس پر عمل کر دیا ہے۔ آخر مغرب کو بھی یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہ بات تو عملنا دھوکہ ہے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ نہیں بھی، عورت کو قانوناً طلاق کا وہی حق دو جو مرد کو حاصل ہے۔ ہمارے حکمرانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ادھر مغرب کو بھی نہیں کہہ سکتے اور ادھر نہیں بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ سینڈوچ بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے اس حوالے سے دہراتے طرز عمل ہیں۔ پہلا ترکی کا طرز عمل ہے کہ دین، شریعت سب کچھ چھوڑا کہ جو تم کہتے ہو، مانتے ہیں، ہمیں یورپیں یونین میں شامل کرو، لیکن سب کچھ کر کے بھی انہیں صلہ نہیں ملا۔ دوسرا طالبان کا طرز عمل تھا کہ بھی بالکل نہیں مانتے، جو کرنا ہے کرو۔ اس کی انہوں نے سزا بھی بھگتی، لیکن مانے نہیں۔ بطور طرز عمل تو یہ دونوں قابل فہم ہیں، قطع نظر اس سے کہ اس کا نتیجہ کیا لگتا۔ تیسرا طرز عمل وہ ہے جو باقی تقریباً تمام مسلمان ممالک کا ہے۔ یہ لوگ درمیان میں پھنسنے ہوئے ہیں۔ جب مغرب کا دباؤ ہوتا ہے تو ان کے مطالبات کو نافذ کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، جب اپنے ملکوں کے عوام کا دباؤ ہوتا ہے تو ان کو خوش رکھنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء۔ اب اس سلسلے میں ہمارے ہاں یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہائی کورٹس مسلسل یہ فیصلے کرتے جا رہے ہیں کہ خلع جو ہے، یہ عورت کا مطلق حق طلاق ہے اور یہ کہ اس میں صرف اصطلاح کا فرق ہے، ورنہ بات ایک ہی ہے۔ خاوند کے حق کو

طلاق کہتے ہیں اور عورت کے حق کو خلع۔ لاہور ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ خلع عورت کا مطلقاً حق طلاق ہے۔ اسی طرح کا ایک فیصلہ سندھ ہائی کورٹ کا بھی آچکا ہے۔

آج سے چند سال قبل ایک ویمن کمیشن بنا جس کے سربراہ سپریم کورٹ کے جسٹس زاہد اسلم صاحب تھے جواب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اس کمیشن نے سفارشات پیش کیں کہ خلع کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے۔ اس کمیشن نے جو طریقہ کار تجویز کیا، وہ یہ تھا کہ جس طرح مرد طلاق نامہ لکھ کر ٹالٹ کو بھیجتا ہے، جس کا نام اب تبدیل کر کے فیملی کورٹ رکھا جا رہا ہے، اسی طرح عورت بھی طلاق کا نوٹس فیملی کورٹ کو بھیجے گی۔ ایک نقل خاوند کو اور ایک نقل فیملی کورٹ کو۔ اب اگر فیملی کورٹ نے اس نوٹس کو سماعت کے لیے منظور کر لیا تو اس کے ساتھ ہی وہ دونوں میاں بیوی نہیں رہیں گے۔ ان کی ازدواجی حیثیت معطل ہو جائے گی۔

## آزادی رائے اور آزادی مذہب

دفعہ نمبر: ۱۸

۰ ”ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی تمثیر، آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے، پیلک یا نجی طور پر تہنیا یاد و سروں کے ساتھ مل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسماں پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔“

۰ ”ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے، جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے، علم اور خیالات کی تلاش کرے، انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔“

تبصرہ:

یہ آزادی مذہب اور آزادی رائے کا حق کہلاتا ہے۔ اس پر بھی ہم سے ان لوگوں کا بہت لمبا تنازع ہے۔ مثلاً، کیا ہم اپنے ملک میں قرآن کریم کے کسی حکم کے خلاف کسی شخص کو رائے رکھنے کا حق دیتے ہیں؟ یا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے کوئی منفی رائے دینے کا حق دیتے ہیں؟

خدا اور مذہب کے خلاف کوئی بات کہنے کا حق دیتے ہیں؟ ان لوگوں کے مطابق ہم آزادی رائے کے حق کو مجرد حکم کر رہے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ بھی، اگر کسی شخص کی خدا کے خلاف ایک رائے قائم ہو گئی ہے تو آپ کون ہوتے ہیں اسے روکنے والے؟ قرآن و رسول کی کسی بات پر ایک شخص مطمئن نہیں، اس نے اس کے خلاف ایک رائے قائم کر لی ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔ یعنی آزادی رائے کا معنی یہ ہے کہ ایک شخص کوئی بھی رائے، کوئی بھی فکر، کسی بھی قسم کے خیالات قائم کرے اور پھر ان کی تبلیغ کرنا چاہے تو یہ اس شخص کا حق ہے۔

## گستاخان رسول اور مغرب

آج کل آزادی رائے کا حق استعمال کیسے ہو رہا ہے؟ ایک معروف شخص ہے سلمان رُشدی جو پہلے انڈین تھا، اب برطانوی ہے۔ (Satanic Verses) شیطانی آیات ناول کے انداز کی ایک کتاب ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ازواج مطہرات اور اکابر صحابہ کرامؐ کو اس نے بہت توہین آمیز انداز سے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ اس نے تمسخر کے انداز سے اس دور کی اکابر شخصیات کا اپنے ناول میں ذکر کیا ہے۔ اس کتاب پر دنیا بھر میں اعتراض ہوا کہ یہ ہم مسلمانوں کے اکابر کی توہین ہے۔ مسلمانوں نے سلمان رُشدی کو گستاخ رسول قرار دیتے ہوئے اسے قتل کرنے کی دھمکیاں بھی دیں، لیکن حکومت برطانیہ نے اس شخص کو اپنی پناہ میں لے لیا اور کئی سالوں سے حکومت برطانیہ اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ اس حفاظت پر لاکھوں پاؤند سالانہ خرچ ہوتا ہے اور حکومت برطانیہ کہتی ہے کہ ہم صرف ایک شخص کی حفاظت نہیں کر رہے، بلکہ ہم آزادی رائے کے حق کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یعنی ان کا کہنا ہے کہ اگر ایک شخص کا تمہارے مذہبی رہنمای محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف ذہن ہو گیا ہے تو تم لوگ اسے بات کرنے سے کیوں روکتے ہو؟ اگر آپ کو اس کی بات سے اختلاف ہے تو آپ تسلیم نہ کریں، لیکن آپ اس کی رائے کے اظہار سے کیوں روکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں ایک اور مثال تسلیمہ نسرين کی ہے۔ اس نے بھی اس طرح کی خرافات پر مشتمل چند کتابیں لکھیں۔ بنگلہ دیش کے علمانے اس کے خلاف مقدمہ دائر کر کے اسے گرفتار کروادیا۔

پورپی یونین نے باقاعدہ سرکاری سطح پر اس کو رہا کرنے کا بندوبست کیا اور ان کا نمائندہ باقاعدہ ڈھاکہ آیا اور اسے چھڑوا کر ساتھ لے کر گیا۔ وہاں اسے مال بھی دیا گیا اور پناہ بھی دی گئی۔

مصر کے ایک صاحب ہیں ڈاکٹر نصرابوزید۔ قاہرہ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی: *الوحی فی مواجهۃ العقل*، ”وحی اور عقل کا مقابل“۔ وہی معزز لہ والی بات کہ وہ بنیاد ہے یا عقل۔ عقل کو وحی پر پھیں گے یا وحی کو عقل پر؟ پرانا جھگڑا نئے انداز میں اٹھایا ہے۔ ہمارے ہاں عقل کی نفع نہیں کی جاتی، لیکن عقل کے لیے معیار وحی کو قرار دیا جاتا ہے، جبکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم وحی کو عقل پر پھیں گے۔ ڈاکٹر نصرابوزید نے عقل کی برتری پر بڑے دلائل دیے۔ نقل کفر کفر نہ باشد، میں اس کے چند ایک جملے نقل کرتا ہوں۔ نصرابوزید کہتا ہے کہ دیکھیں، آج کا ایک شخص جو ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہے، اٹرینیٹ استعمال کرتا ہے، آج کی جدید شیکناں وحی پر عبور رکھتا ہے، اس شخص کو اُس شخص کی پیروی کرنے کے لیے کہا جاتا ہے جو خیموں میں رہتا تھا اور خپر پر سواری کرتا تھا۔ یہ ڈاکٹر نصرابوزید کے بات کرنے کا انداز نقل کر رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک ان اساطیر اور خرافات سے آج کی نسل نجات حاصل نہیں کرے گی، ترقی نہیں کر پائے گی جن اساطیر اور خرافات سے قرآن کریم بھرا ہوا ہے۔ (نعوذ بالله)

جس طرح ہمارے ہاں تو ہیں رسالت پرموت کی سزا کا قانون ہے، اس طرح کا کوئی قانون مصر میں نہیں ہے۔ ہمارے اس قانون پر دنیا کو اعتراض ہے کہ ایک آدمی کی رائے اگر قرآن اور رسول اللہ کے خلاف ہو گئی ہے تو اس پر اسے تم موت کی سزا کیسے دے سکتے ہو؟ چنانچہ اس قانون کو ختم کرنے کے لیے مسلسل مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ہم پر اس قانون کو ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ یہ آزادی رائے کے منافی ہے۔ مصر میں تو ہیں رسالت پر سزا کا قانون تو نہیں ہے، لیکن وہاں شافعی فقہ کے مطابق عالمی قوانین نافذ ہیں۔ چنانچہ مصر کے ولکانے عدالت میں فتح نکاح کا دعویٰ دائر کیا کہ یہ شخص ایسی باتیں کہہ کر چونکہ مسلمان نہیں رہا، اس لیے اس کا نکاح اس کی بیوی سے ثبوت گیا ہے۔ عدالت نے تفہیق کی ڈگری جاری کر دی۔ اس شخص کو بھی ڈنمارک کی حکومت نے پناہ دے دی جہاں وہ عیاشی کی زندگی بسر کرتا رہا۔

اسی طرح ڈنمارک کے اخبارات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تو ہیں آمیز کارٹون چھاپے جن پر ابھی تک جھگڑا چل رہا ہے۔ ان اخبارات کا موقف بھی اسی دفعہ کے حوالے سے ہے کہ آزادی خیال، آزادی فکر، آزادی رائے اور اپنی رائے کی اشاعت، یہ سب ہمارے حقوق ہیں۔ ہم نے اگر یہ کارٹون چھاپے ہیں تو اپنا حق استعمال کیا ہے۔

ہمارے ہاں آزادی رائے کا حق مطلقاً نہیں دیا جاتا۔ وہ تمام قوانین جن میں تو ہیں رسالت کا قانون بھی ہے، کسی غیر مسلم کو اپنے مذہب کی عام تبلیغ نہ کرنے کی پابندی بھی ہے اور خدا رسول اور شعائر اسلام وغیرہ کے خلاف بات نہ کرنے کی پابندی بھی ہے، یہ سب انسانی حقوق کے منافی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ گزشتہ سال امریکہ نے ہماری حکومت سے آن ریکارڈ تین مطالبات کیے تھے۔ پہلا یہ کہ حدود آرڈیننس کو ختم کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ تو ہیں رسالت کی سزا کا قانون ختم کیا جائے۔ تیسرا یہ کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا قانون ختم کیا جائے۔ پہلا مطالبہ تو ہماری حکومت نے حدود آرڈیننس کا صفائیا کر کے پورا کر دیا ہے۔ باقی دو مطالبوں کے متعلق امریکہ کو یقین دہانی کرائی گئی کہ وہ ایکشن کے بعد پورے کر دیے جائیں گے۔

### ارتدا اور قادیانی مسئلہ

یہ جھگڑے تو آزادی رائے کے حوالے سے ہیں۔ اب آئیے دیکھئے ہیں کہ آزادی مذہب کے حوالے سے ہمارے کیا تنازعات ہیں۔

آزادی مذہب کے حوالے سے یہ لوگ دو باتیں کہتے ہیں۔ ایک بات تو یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنے مذہب کو تبدیل کر کے کوئی دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے تو اس شخص کو ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہمارے ہاں یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔ ہم اسلام سے مخالف ہونے والے کو مرتد کہتے ہیں اور اسے سزا کا مستحق سمجھتے ہیں۔

دوسری بات یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ کسی ملک میں مذہب کی بنیاد پر امتیازی قوانین نہیں بنائے جائیں گے۔ یہ بات ذرا تفصیل سے سمجھنے کی ہے۔ ہمارے ہاں ۱۹۷۲ء میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا قانون بنایا گیا۔ قادیانیوں کے بارے میں علمانے بہت بحث کی ہے۔ جو شخص

مسلمان سے قادریاں ہوائے، اسے شرعی اصطلاح میں ہم مرتد کہتے ہیں اور جو شخص کسی قادریاں کے ہاں پیدا ہوا ہے، اسے زندگی کہا جاتا ہے۔ جب مرتضیٰ غلام احمد قادریاں نے اپنی نبوت کا دعویٰ اور پرچار کیا، اسے یہ شوق ہوا کہ وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرز پر ارد گرد کے حکمرانوں کو اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دے۔ اس نے ایک خط واں افغانستان امیر حبیب اللہ خان کو بھیجا کہ تم میرا مذہب قبول کرلو۔ پڑھانوں کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ وہ ایک آزاد اور خود مختار حکمران تھا۔ اس نے جواب بھیجا اور ایک جملہ لکھا کہ: ”ایں جابیا“ کہ یہاں آ کر بات کرو۔

مرزا نے کابل میں دونماہنڈے بھیجے، امیر نے دونوں کو لٹکا دیا۔ اس پر بحث چھڑ گئی کہ آیا مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کیا گیا کہ آیا قرآن میں ارتداد کی سزا ہے یا نہیں۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کا ایک رسالہ ہے ”الشہاب“۔ اس رسالہ میں حضرت شیخ نے قرآن کریم سے استدلال کیا ہے۔ ہمارے ہاں ایک اصول ہے کہ اگر قرآن کریم گزشتہ مذاہب کا کوئی حکم بیان کرے اور اس کی تفسیخ نہ کرے تو وہ حکم ہمارے لیے بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ پچھلے مذاہب کے لیے تھا۔ مثلاً قرآن نے قصاص کے بارے میں تورات کا قانون حکما نہیں بلکہ حکایتاً بیان کیا ہے اور یہ ہمارے لیے بھی حکم ہے۔ علامہ عثمانی نے کہا کہ ہمارا اصول یہ ہے کہ قرآن کریم پرانی شریعتوں کا کوئی حکم بیان کرے اور پھر اس کی تفسیخ کی بات نہ کرے تو وہ جیسے چھلی امتوں کے لیے قانون تھا، ویسے ہی ہمارے لیے بھی قانون ہے۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ بنی اسرائیل میں پچھڑے کی پوجا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے فَاقْتُلُوا انفسَكُمْ (البقرة: ۵۳) کہہ کر ارتداد کی سزا دی اور پھر کسی جگہ پر اس کو منسوخ نہیں کیا۔

جب پاکستان بنا تو ایک مسئلہ پیدا ہو گیا کہ قادریاں کو کیا معاملہ ہو گا۔ ہمارے علمانے پاکستان بننے کے بعد تین چار بڑے مسائل پر غیر معمولی اجتہادات کیے ہیں۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ قادریاں کے ساتھ کیا معاملہ کریں گے۔ اس پر تمام مکاتب فکر کے علماء، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، سب نے متفق ہو کر ایک اجتہادی فیصلہ یہ کیا کہ قادریاں پر ہم قتل کا حکم جاری نہیں کریں گے، بلکہ ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے گا۔ یہ تجویز اصل میں علامہ اقبال مرحوم کی تھی کہ اتنے

گھمبیر حالات میں قادیانیوں کو اتنے بڑے پیارے پر قتل نہیں کیا جاسکے گا، اس کا بہتر حل یہ ہے کہ انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دلوادیا جائے۔ اس سلسلے میں ۱۹۵۳ء میں ایک تحریک چلی۔ پھر ۱۹۷۲ء میں ایک اور تحریک چلی جس میں حضرت مولانا مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالحق اور دیگر بڑے اکابر علماء رحمہم اللہ عجمین شریک تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ قادیانیوں نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ ہم ہی مسلمان ہیں۔

۱۹۸۳ء میں جزل ضیاء الحق نے یہ آرڈیننس جاری کیا کہ قادیانیوں کو اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ اسلام کے شعائر استعمال نہیں کر سکیں گے، مثلاً امام المؤمنین، مسجد، نماز، روزہ وغیرہ کی اصطلاحات استعمال نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ یہ دو قوانین بھی بین الاقوامی حلقوں کی نظر میں متنازعہ ہیں۔ جب ہم سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ قادیانیوں کے خلاف اقدامات منسوخ کیے جائیں تو ان سے مراد یہی دو قوانین ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال ایک بہت بڑا مغالطہ ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس سلسلہ میں ہمیں بہت مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔

## قادیانی غیر مسلم کیوں ہیں؟

۱۹۸۷ء میں نیویارک میں میرا ایک یہودی صحافی سے مکالمہ ہوا۔ میرے ایک دونست نے اس کا اہتمام کیا۔ ان دونوں یہ مسئلہ بڑے زوروں پر تھا۔ اس نے سوال کیا کہ جب قادیانی قرآن کو بھی مانتے ہیں اور محمد کو بھی مانتے ہیں تو وہ مسلمان کیوں نہیں ہیں؟ اب اللہ کو تو اور بہت سے لوگ مانتے ہیں، اس لیے بظاہر تو مسلمان ہونے کی امتیازی علامت بھی ہے کہ وہ قرآن کو مانتا ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو مانتا ہو۔ میں نے اس کے سامنے لمبے چوڑے دلائل دینے کے بعد جائے اٹا اس سے ایک سوال کر دیا۔ میں نے کہا کہ تم یہودی ہو، تم حضرت موسیٰ اور تورات کو مانتے ہو؟ کہنے لگا، ہاں۔ میں نے کہا کہ عیسائی بھی موسیٰ اور تورات کو مانتے ہیں۔ اگر کوئی عیسائی یہودی ہونے کا دعویٰ کر دے تو کیا تم مان لو گے؟ کہنے لگا، نہیں۔ میں ایک عیسائی کو یہودی کیسے مان سکتا ہوں؟ میں نے پوچھا، کیوں؟ اس نے کہا کہ وہ موسیٰ اور تورات کے بعد عیسائی اور انجیل کو بھی مانتے ہیں، اس

لیے وہ یہودی نہیں ہو سکتے۔ وہ الگ ہیں۔ میں نے کہا کہ دیکھو، میں عیسیٰ، موسیٰ، تورات، انجیل ان سب کو مانتا ہوں۔ میں اگر یہ کہہ دوں کہ میں یہودی ہوں تو مان لو گے؟ کہنے لگا، نہیں، اس لیے کہم ان سب کے بعد قرآن اور محمد کو بھی مانتے ہو۔ میں نے کہا، پھر تو یہ اصول یہ ہوا کہ نئی کتاب اور نئے رسول کو ماننے سے مذہب الگ ہو جاتا ہے، اس لیے میں یہ چیزیں نہیں کرتا کہ قادیانی قرآن اور محمد کو نہیں مانتے۔ وہ موسیٰ اور تورات، عیسیٰ اور انجیل، قرآن اور محمد سب کو مانتے ہوں گے، لیکن ان کے بعد ایک اور نبی کو بھی مانتے ہیں، اس لیے میں انہیں یہودی، عیسائی اور مسلمان، ان تینوں میں سے کچھ بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ قادیانی مرزا غلام احمد کو نبی اور ”تذکرہ“ نامی کتاب کو وجی کی کتاب مانتے ہیں۔ اس صحافی نے کہا کہ میری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ چونکہ وہ ایک نئے نبی اور ایک نئی کتاب کو مانتے ہیں، اس لیے وہ مسلمان کہلانے کے حق دار نہیں ہیں۔

اس نے ایک اور سوال کر دیا کہ تم لوگ انہیں مسجد بنانے، اذان دینے اور کلمہ وغیرہ پڑھنے سے کیوں روکتے ہو؟ یہ تو انسانی حقوق کے منافی ہے۔ میں نے کہا، میرے بھائی! ذرا اٹھنڈے دل سے میری بات سنو۔ ایک کمپنی ہے جو سو سال سے چلی آ رہی ہے۔ اس کا ایک نام ہے، ایک ٹریڈ مارک ہے۔ اس کمپنی کی مارکیٹ میں ایک ساکھ ہے اور لوگ اس کے ٹریڈ مارک کو دیکھ کر اس کی اشیا خریدتے ہیں۔ اب اگر اس میں سے دو چار آدمی الگ ہو کر نئی کمپنی بنالیں، کیا اس نئی کمپنی کو پرانی کمپنی کا نام یا اس کا ٹریڈ مارک استعمال کرنے کا حق حاصل ہے؟ وہ جرئت کہنے لگا، نہیں۔ میں نے کہا، اگر وہ ایسا کریں تو؟ کہنے لگا کہ یہ توفراً ہے۔ میں نے کہا، ہم لوگ یہی تو کہہ رہے ہیں کہ قادیانی ہمارے ساتھ فراڈ کر رہے ہیں۔ میں نے کہا، بھائی ہم چودہ سو سال سے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری کمپنی کا نام اسلام ہے۔ کلمہ، امیر المؤمنین، خلیفۃ المسالمین، مسجد، اذان، نماز، یہ سب ہمارے ٹریڈ مارکس ہیں۔ اب کچھ لوگوں نے نئی کمپنی بنائی کہ اس کا یہی نام اور یہی ٹریڈ مارک رکھ لیے ہیں۔ ہمارا مطالبہ تو بس یہ ہے کہ بھائی، اپنا نام اور ٹریڈ مارک الگ کرو۔ یہ تو اٹا چور کو تو وال کوڑا نئے والی بات ہو گئی ہے۔ زیادتی پر زیادتی وہ لوگ کرتے چلے آ رہے ہیں اور ہم جب عدالت میں جا کر انصاف طلب کرتے ہیں تو یہ الزام ہم پر گلگ جاتا ہے کہ ہم ان لوگوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ شناخت تو ہماری

مجروح ہو رہی ہے، ہمارے نام اور ہمارے ٹریڈ مارکس پر یہ لوگ دونبزمال بیچ رہے ہیں۔

امریکہ، مغرب اور اقوام متحده وغیرہ ہم سے کہتے ہیں کہ جب آزادی رائے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے تو آپ قادر یاں کیوں لگاتے ہیں؟ یہ انسانی حقوق کے منافی ہے، آزادی مذہب کے خلاف ہے، آزادی فکر کے خلاف ہے اور اس سارے اذام کی بنیاد اقوام متحده کے منشور کی یہ دفعہ ہے۔ ان حضرات کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر آپ لوگوں نے اس منشور پر دستخط کر کے ہیں تو آپ اس منشور کی اس دفعہ پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ اس کے خلاف آپ لوگوں نے قوانین کیوں بنارکھے ہیں۔

ہماری اصل الجھن یہ ہے کہ ہم نے اقوام متحده کے منشور پر دستخط بھی کر رکھے ہیں، اس لیے کہ ہم نے میں الاقوامی برادری کے ساتھ مل کر رہنا ہے، اس کے بغیر رہنا عملًا کم از کم ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور دوسری طرف ہم مذہب کی طرف سے پابند ہیں کہ اپنی نصوص صریحہ اور قطعیہ کے خلاف عمل بھی نہیں کر سکتے۔

اقوام متحده نے تقریباً تمام شعبہ ہائے زندگی کے متعلق اصول طے کیے ہوئے ہیں۔ جس طرح خاندانی زندگی کا ایک معیار طے کر رکھا ہے کہ اس سے ہٹ کر جو بھی بات اور قانون ہو گا، اسے یہ انسانی حقوق کے منافی قرار دیں گے اور جس طرح سزاوں اور تعزیرات کے انہوں نے اصول قائم کیے ہوئے ہیں کہ ان کے خلاف کوئی قانون ہو گا تو اسے انسانی حقوق کے خلاف سمجھا جائے گا، اسی طرح آزادی رائے، آزادی مذہب کا ایک معیار انہوں نے قائم کیا ہوا ہے۔ اس سے ہٹ کر کوئی بات ہو گی تو اسے یہ لوگ انسانی حقوق کے منافی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خاندانی نظام، عدالتی نظام، مالیاتی نظام، سیاسی نظام اور دیگر زندگی کے شعبوں کے متعلق انہوں نے مخصوص معیار قائم کیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اقوام متحده نے یہ بھی طے کر رکھا ہے کہ وہ کس سیاسی نظام کو صحیح سمجھیں گے اور کس نظام کو صحیح نہیں سمجھیں گے۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ اقوام متحده کا منشور سیاسی نظام کے متعلق کیا کہتا ہے۔

## اسلام کا سیاسی نظام

دفعہ نمبر ۲۱:

”ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔ ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر حق ہے۔ عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقت فتو قتا یہ حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی سے ہوں گے اور جو خفیہ ووث یا اس کے مساوی کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔“

تبصرہ:

یعنی اقوام متحده کے نزدیک ایک جائز حکومت وہ کہلانے گی جو عوام کے وٹوں سے منتخب ہو اور ملک کے ہر شہری کو بالواسطہ یا بلا واسطہ اس میں رائے دینے کا حق حاصل ہو۔ جو حکومت اس معیار پر پورا نہیں اترتی، وہ اقوام متحده کے نزدیک جائز حکومت قرار نہیں پائے گی۔

اس میں تین چار الگ الگ مسئلے ہیں۔ آج ہمارے ہاں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جمہوریت اور اسلامی نظام میں کیا فرق ہے اور جمہوریت کس حد تک جائز ہے؟ پہلے تو میں اپنے نظام کے حوالے سے بات کرتا ہوں۔ اسلام کے سیاسی نظام کی اصطلاح ہے ”خلافت“۔ قرآن کریم نے یہ اصطلاح دی ہے:

يَا دَاؤْدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ (ص ۳۸: ۲۶)

”اے داؤد، ہم نے تمھیں زمین میں صاحب اقتدار بنایا ہے۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا:

كَانَتْ بَنُو اسْرَائِيلَ تَسْوِيْهُمُ الْأَنْبِيَاءُ، كَلَمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلْفَهُ نَبِيٌّ،

وَانَّهُ لَا نَبِيٌّ بَعْدَهُ وَسِيَّكُونُ خَلْفَاءُ فِي كُثُرٍ (بخاری، رقم ۲۳۵۵)

”نبی اسرائیل میں انہیا سیاسی نظام کی قیادت کرتے تھے۔ جب کوئی نبی فوت ہو جاتا تو اس کی

جگہ دوسرا نبی آ جاتا تھا۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا، ہاں خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے۔“  
بخاری شریف کی یہ حدیث اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد ہے۔

## خلافت اور امامت کا فرق

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیاسی نظام کے حوالے سے جو سب سے پہلا اور سب سے بڑا جھگڑا قرار دیا جاتا ہے، وہ خلافت اور امامت کے حوالہ سے ہے۔ ہمارے ہاں حضورؐ کے بعد سیاسی نظام خلافت کے نام سے ہے۔ اہل تشیع کے ہاں یہ نظام امامت کے نام سے ہے۔

خلافت اور امامت میں تین بنیادی فرق ہیں:

پہلا فرق یہ ہے کہ خلافت منصوص نہیں، بلکہ امامت کے اختیار پر ہے، جبکہ امامت منصوص ہے۔  
دوسرافرق یہ ہے کہ خلافت خاندانی یا نسبی نہیں ہے، جبکہ امامت خاندانی ہے۔ اہل تشیع کے  
بارہ امام ایک ہی خاندان سے ہیں، جبکہ یہ <sup>خُلیفہ</sup> صاحب اور خامنہ ای صاحب وغیرہ تم تو امام غائب  
کے نمائندے ہیں۔

تیسرا فرق یہ کہ خلیفہ معصوم نہیں ہے۔ خلیفہ کی کسی بھی بات سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا  
سکتا ہے، جبکہ امام معصوم ہے اور امام کی کسی بھی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ امام جو کہہ دے،  
وہی قرآن کی نشانہ ہے اور جو کہہ دے، وہی سنت کا مقصد ہے۔ امام کے معصوم ہونے کا معنی یہ ہے  
کہ وہ غلطی سے پاک ہے۔ دوسرے لفظوں میں امام اتحاری ہے۔

حاصل یہ ہے کہ امامت مسلمہ کی اکثریت یعنی اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک خلافت کی بنیاد ان  
اصولوں پر ہے کہ:

(۱) خلیفہ کا انتخاب عام مسلمانوں کی مرضی سے ہو گا،

(۲) خلافت نسبی یا خاندانی نہیں ہو گی،

(۳) خلیفہ شخصی اتحاری کی بجائے قرآن و سنت کے مطابق حکومت کرے گا،

(۴) خلیفہ کی کسی بھی بات اور کسی بھی فیصلے سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

اسے سیاسی اصطلاح میں قانون اور دلیل کی حکومت کہتے ہیں، کیونکہ بادشاہت میں بادشاہ ہی

خود اتحاری ہوتا تھا مگر خلیفہ ایک پہلے سے طے شدہ قانون کا پابند ہوتا ہے اور اسے اسی کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر جمہوریت کا معنی یہ ہے کہ حکومت عوام کی منتخب کردہ ہوا اور ان کی مرضی سے قائم ہوتی یہ جمہوریت سب سے پہلے اسلام نے قائم کی ہے۔ البتہ ہماری اصطلاح جمہوریت نہیں بلکہ شورائیت ہے۔ مگر جمہوریت کے دوسرے رُخ کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے کہ عوام اور ان کے منتخب نمائندے تمام فیصلوں میں آزاد ہیں اور وہ جو بھی طے کر دیں، وہی قانون ہے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے جو اتحاری بادشاہ کو حاصل ہوتی تھی، جمہوریت میں وہی اتحاری پارلیمنٹ کو حاصل ہو گئی ہے، لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ حکمران، پارلیمنٹ اور عوام تینوں کو قرآن و سنت کا پابند دیکھنا چاہتا ہے اور یہی اسلامی خلافت کا بنیادی اصول ہے۔ آج کی اصطلاح میں اسے ”پارلیمنٹ کی خود اختاری“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہم جب یہ کہتے ہیں کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کی پابند ہو گئی تو اس پر جدید سیاسی حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ”پارلیمنٹ کی خود اختاری“ کے خلاف ہے۔

پاکستان بننے کے بعد ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام نے ۲۲ دستوری نکات اور قرارداد مقاصد کی صورت میں تین اجتہادی اصول طے کیے:

- ۱۔ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہوگی،
- ۲۔ حکومت عوام کے منتخب نمائندے کریں گے،
- ۳۔ حکومت اور پارلیمنٹ قرآن و سنت کے پابند ہوں گے۔

بہر حال سیاسی نظام کے حوالہ سے اقوام متحده کے طے کردہ اصولوں کے بارے میں ہمارے یہ تحفظات ہیں جن کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے اور ہمارے ان عقائد پر ہے جن سے ہم کسی صورت میں دست بردار نہیں ہو سکتے، لیکن عالمی اداروں کا اقوام متحده کے منشور کے عنوان سے ہم پر مسلسل دباؤ ہے کہ ہم حکومت، دستور و قانون اور پارلیمنٹ کو مذہب کے اثر سے آزاد کر کے عوام اور پارلیمنٹ کی مطلق خود اختاری کے تصور کو تسلیم کریں جس کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔

## خلاصہ بحث

محترم علماء کرام! میں نے تین چار نشتوں میں آپ حضرات کے سامنے اقوام متحده کے انسانی حقوق کے چار ٹرکی چند دفعات پر تبصرہ کیا ہے اور ان تحفظات سے آگاہ کیا ہے جو اسلامی عقائد اور قرآن و سنت کی تعلیمات کی بنیاد پر ہم اس بین الاقوامی قانون کے بارے میں رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ کسی علمی مرکز میں ایک مستقل کام کے طور پر اس موضوع کو اختیار کرتے ہوئے جید علماء کرام کی ایک ٹیم اقوام متحده کے اس منشور کا شق دار جائزہ لے اور تجزیہ و تحلیل کے ساتھ اس بات کو واضح کرے کہ:

- ۵ انسانی حقوق کے اس منشور کی کون کون سی بات ہمارے لیے قابل قبول ہے،
- ۵ ہمیں کس کس بات سے اختلاف ہے اور کون سی باتیں ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہیں،
- ۵ اختلاف کی وجہ اور ہماری ترجیحات کے دلائل کیا ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اسلامی قوانین کی برتری اور افادیت کو بھی آج کے اسلوب میں بیان کیا جائے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ یہ منشور نہ سارے کاسارا قابل قبول ہے اور نہ ہی پورے منشور کو یکسر مسترد کر دینا درست ہے۔ اسی طرح میری طالب علمانہ رائے یہ بھی ہے کہ جن امور میں ہم اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلمہ اصول اجتہاد کے دائرے میں رہتے ہوئے آج کے عالمی عرف اور بین الاقوامی ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اور ایڈ جسٹمنٹ کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں، ہمیں اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے اور مسائل و امور کے پوری طرح تجزیہ و تدقیق کے بعد جو موقف واضح ہو کر سامنے آئے، اسے مغرب کے سامنے پوری جرأت کے ساتھ پیش کر کے اس کے لیے عالمی سطح پر لانگ اور ذہن سازی کی ضرورت ہے تاکہ ہم اسلام کے بارے میں عالمی رائے عامہ کی غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکیں اور آج کے ماحول، عالمی عرف اور بین الاقوامی اسلوب کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا فریضہ صحیح طور پر انجام دے سکیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں اور اس کے لیے اسباب و موقع، ثمرات و نتائج اور قبولیت و رضا سے بہرہ و فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔



## اقوام متحده کی جزو اسٹبلی کے منظور کردہ انسانی حقوق کے عالمی منشور کا متن

تمام بُنی نوع انسان مساوی اور ناقابل تغیر حقوق اور بنیادی آزادیاں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اقوام متحده ہر فرد کے انسانی حقوق کے تحفظ و ترقی کا پرچم بلند رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ یہ ذمہ داری اور وابستگی اقوام متحده کے منشور سے مأخوذه ہے جس میں انسان کی حرمت و تقارب اور بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں دنیا کے عوام کے یقین کی توثیق کی گئی۔ اقوام متحده کی جزو اسٹبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو ”انسانی حقوق کا عالمی منشور“، منظور کر کے اس کا اعلان عام کیا۔

### تمہید و متن

چونکہ ہر انسان کی ذاتی عزت اور حرمت اور انسانوں کے مساوی اور ناقابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا دنیا میں آزادی، انصاف اور امن کی بنیاد ہے۔ چونکہ انسانی حقوق سے لاپرواںی اور ائمی بے حرمتی اکثر ایسے وحشیانہ افعال کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے جن سے انسانیت کے ضمیر کو سخت صدمے پہنچے ہیں اور عام انسانوں کی بلند ترین آرزدیہ رہی ہے کہ ایسی دنیا وجود میں آئے جس میں تمام انسانوں کو اپنی بات کہنے اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو اور خوف اور احتیاج سے محفوظ رکھا جائے۔

چونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عملداری کے ذریعے محفوظ رکھا جائے۔

اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ انسان عجز آکر جزو استبداد کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہوں۔

چونکہ یہ ضروری ہے کہ قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بڑھایا جائے۔

چونکہ رکن اقوام نے اقوام متحده کے چارٹر میں بنیادی انسانی حقوق، انسانی شخصیت کی حرمت و وقار اور مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عقیدے کی دوبارہ تصدیق کر دی ہے اور وسیع تر آزادی کی فضائی معاشرتی ترقی کو تقویت دینے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

چونکہ رکن ملکوں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ اقوام متحده کے اشتراک عمل سے ساری دنیا میں اصول اور عمل انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کا زیادہ احترام کریں گے اور کرامیں گے۔

چونکہ اس عہد کی تکمیل کے لیے بہت ہی اہم ہے کہ ان حقوق اور آزادیوں کی نوعیت کو سب سمجھ سکیں۔ لہذا اب

## جزل اسمبلی

اعلان کرتی ہے کہ:

انسانی حقوق کا عالمی منشور تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا مشترک معیار ہو گا تاکہ ہر فرد اور معاشرے کا ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ان حقوق آزادیوں کا احترام پیدا کرے اور انہیں قومی اور میں الاقوامی کارروائیوں کے ذریعے رکن ممالکوں میں اور ان قوموں میں جو رکن ملکوں کے ماتحت ہوں، منوانے کے لیے بتدریج کوشش کر سکے۔

دفعہ ا:

تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں ضمیر اور عقل و دلیعت ہوئی ہے اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ ۲:

(۱) ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس

کے حق پرنس، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قوم، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔

(۲) اس کے علاوہ جس علاقے سے جو شخص تعلق رکھتا ہے، اس کی سیاسی کیفیت کا دائرہ اختیار یا بین الاقوامی حیثیت کی بنابر اس سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، چاہے وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تو لیتی ہو یا غیر مختار ہو یا سیاسی اقتدار کے لحاظ سے کسی دوسری بندش کا پابند ہو۔

**دفعہ ۳:**

ہر شخص کو اپنی جان، آزادی اور رذائلی تحفظ کا حق ہے۔

**دفعہ ۴:**

کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کرنہ رکھا جاسکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو، منوع قرار دی جائے گی۔

**دفعہ ۵:**

کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوز یا گھٹیا سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔

**دفعہ ۶:**

ہر شخص کا حق ہے کہ ہر مقام پر قانون اس کی شخصیت کو تسلیم کرے۔

**دفعہ ۷:**

قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حقدار ہیں۔ اس اعلان کے خلاف جو تفریق کی جائے یا جس تفریق کے لیے ترغیب دی جائے، اس سے سب برابر کے چاؤ کے حقدار ہیں۔

**دفعہ ۸:**

ہر شخص کو ان افعال کے خلاف جو اس دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کو تنفس

کرتے ہوں، با اختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے پر چارہ جوئی کرنے کا پورا حق ہے۔

دفعہ ۹:

کسی شخص کو محض حاکم کی مرضی پر گرفتار، نظر بند یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ ۱۰:

ہر ایک شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کا تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے بارے میں مقدمہ کی سماعت آزاد اور غیر جانبدار عدالت کے کھلے اجلاس میں منصفانہ طریقے پر ہو۔

دفعہ ۱۱:

(۱) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری کا الزام عائد کیا جائے، بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے تا وقٹیکہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع نہ دیا جا چکا ہو۔

(۲) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگز اشت کی بنا پر جوار تکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں مأخوذه نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ ۱۲:

کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے گی اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کا حق ہے کہ قانون اسے حملے یا مداخلت سے محفوظ رکھے۔

دفعہ ۱۳:

(۱) ہر شخص کا حق ہے کہ اسے ہر ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور سکونت اختیار کرنے کی آزادی ہو۔

(۲) ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ملک سے چلا جائے، چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی

طرح اسے ملک میں واپس آجائے کا بھی حق ہے۔

#### دفعہ ۱۲:

(۱) ہر شخص کو ایذا ارسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ ڈھونڈنے اور پناہ مل جائے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(۲) یہ حق ان عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں لا جایا جاسکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہے جو قوامِ متحده کے مقاصد اور اصول کے خلاف ہیں۔

#### دفعہ ۱۵:

(۱) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(۲) کوئی شخص محض حاکم کی مرضی پر اپنی قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور اس کی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار نہ کیا جائے گا۔

#### دفعہ ۱۶:

(۱) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل قومیت یا مذہب کی بناء پر لگائی جائے، شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی اور نکاح کو فتح کرنے کے معاملہ میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(۲) شادی فریقین کی مکمل اور آزاد ادائی رضامندی سے ہوگی۔

(۳) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے تحفظ کا حق دار ہے۔

#### دفعہ ۱۷:

(۱) ہر انسان کو تنہایا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(۲) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ: ۱۸:

ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پلک میں یا بھی طور پر تنہایا دوسروں کے ساتھ مل جل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسوم پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ: ۱۹:

ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے اور جس ذریعے سے چاہے، بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے، علم اور خیالات کی تلاش کرے، انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔

دفعہ: ۲۰:

- (۱) ہر شخص کو پر امن طریقے پر ملنے جلنے اور انجمیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔
- (۲) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

دفعہ: ۲۱:

- (۱) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔
- (۲) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔
- (۳) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی و قیادو قیادی یعنی حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی سے ہوں گے اور جو خفیہ و وث یا اس کے مساوی کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ: ۲۲:

معاشرے کے رکن، کامیابی، احتشام سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی کہ وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی،

معاشرتی اور شفاقتی حقوق کو حاصل کرے جو اس کی عزت اور شخصیت کے نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ ۲۳:

(۱) ہر شخص کو کام کا ج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کا ج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(۲) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(۳) ہر شخص جو کام کرتا ہے، وہ ایسے مناسب و معقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لیے باعزم زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرا ذریعوں سے اضافہ کیا جاسکے۔

(۴) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ ۲۴:

ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تباہ کے علاوہ مقررہ وقوف کے ساتھ تعطیلات بھی شامل ہیں۔

دفعہ ۲۵:

(۱) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشش، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات شامل ہیں اور بے روزگاری، بیماری، معدودی، بیوگی، بڑھاپا، ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔

(۲) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی سے پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ ۲۶:

(۱) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم مفت ہوگی کم از کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ و رانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنابر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہو گا۔

(۲) تعلیم کا مقصد انسانی خصیت کی پوری نشوونما ہو گا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہو گی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا نمذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحده کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(۳) والدین کو اس بات کے انتخاب کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

#### دفعہ ۲۷:

(۱) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، ادبیات سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(۲) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفاد کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، عملی یا ادبی تصنیف سے جس کا وہ مقصود ہے، حاصل ہوتے ہیں۔

#### دفعہ ۲۸:

ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام میں شامل ہونے کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں پیش کردیے گئے ہیں۔

#### دفعہ ۲۹:

(۱) ہر شخص پر معاشرے کے حقوق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر ہی اس کی خصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

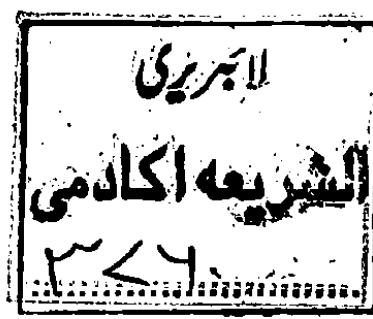
(۲) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہو گا جو

دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرنے کی غرض سے یا جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں۔

(۳) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحده کے مقاصد اور اصول کے خلاف عمل میں نہیں لائی جاسکتیں۔

### دفعہ ۳۰:

اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مرا نہیں لی جاسکتی جس سے ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی تحریب ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔



# الشريعة اکادمی گوجرانوالہ کی چند علمی و فکری مطبوعات

## ☆ علوم الحدیث- اصول و مبادی

تحقیقات: شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفردر - ترتیب و مدوین: محمد عمار خان ناصر

## ☆ خطبہ ججۃ الوداع: اسلامی تعلیمات کا عالمی منشور

مدوین متن: محمد عمار خان ناصر۔ توضیح محاضرات: ابو عمر زاہد الراشدی

## ☆ جہاد، مراحت اور بغاوت (اسلامی شریعت اور بین الاقوامی قانون کا تقابلی مطالعہ)

از: پروفیسر مشتاق احمد

## ☆ متون حدیث پر اعتراضات و اہلکالات- ایک تحقیقی جائزہ از: ڈاکٹر محمد اکرم ورک

## ☆ مسلمانوں کا دینی و عصری نظام تعلیم خطبات و محاضرات از: ڈاکٹر محمود احمد غازی

☆ خطبات راشدی (جلد اول) از: ابو عمر زاہد الرashدی

## ☆ جناب جاوید احمد غامدی کے حلقة فکر کے ساتھ ایک علمی و فکری مکالمہ

از: ابو عمر زاہد الرashدی / معزاً مجد اخور شید احمد ندیم / ڈاکٹر محمد فاروق خان

## ☆ دینی مدارس اور عصر حاضر (الشريعة اکادمی کے زیر اہتمام فکری نشستوں کی روادار)

مرتب: شبیر احمد خان میواتی

## ☆ عصر حاضر میں اجتہاد- چند فکری و عملی مباحث از: ابو عمر زاہد الرashدی

## ☆ مذہبی جماعتیں اور قومی سیاست از: ابو عمر زاہد الرashدی

## ☆ اطراف- دینی تعبیر کے چند نئے گوشے (مجموعہ مقالات) از: میاں انعام الرحمن

## ☆ متحده مجلس عمل- توقعات، کارکردگی اور انجام از: ابو عمر زاہد الرashدی

## ☆ حدود آرڈیننس اور تحفظ نسوان میں از: ابو عمر زاہد الرashدی

## ☆ جزل پرویز مشرف کا دور اقتدار از: ابو عمر زاہد الرashدی

## ☆ اسلام اور انسانی حقوق (اقوام متحده کے عالمی منشور کے تناظر میں) از: ابو عمر زاہد الرashدی



”جن امور میں ہم اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلمہ اصول اجتہاد کے دائرے میں رہتے ہوئے آج کے عالمی عرف اور بین الاقوامی ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اور ایڈ جسٹمنٹ کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں، ہمیں اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے اور مسائل و امور کے پوری طرح تجزیہ و تدقیق کے بعد جو موقف واضح ہو کر سامنے آئے، اسے مغرب کے سامنے پوری جرأت کے ساتھ پیش کر کے اس کے لیے عالمی سطح پر لابنگ اور ذہن سازی کی ضرورت ہے تاکہ ہم اسلام کے بارے میں عالمی رائے عامہ کی غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکیں اور آج کے ماحول، عالمی عرف اور بین الاقوامی اسلوب کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا فریضہ صحیح طور پر انجام دے سکیں۔“

## الشرعیہ اکادمی